د دوکس رزی کیانی تاریخ

ابراهیم جلیس

دو ملک، ایک کہانی

[illegible] ۹

ابراہیم جلیس

— تقسیم مثیر

دو ملک ایک کہانی

ابراہیم جلیس

نیا ادارہ لاہور

باراوّل
قیمت دو روپے آٹھ آنے

پبلشر: نیا ادارہ - لاہور
پرنٹر: عالمگیر پریس لاہور

حمید اختر کے نام

جو موت کی گھنیری چھاؤں میں اپنی بہن کی لاش کندھے پر
اٹھائے انسانی لہو کی ہزاروں ندیاں عبور کرتا اپنا سب
کچھ لٹا کر لدھیانے سے لاہور پہنچا۔ لاہور والٹن کیمپ میں
ہیضہ اور ملیریا کے بیچوں بیچ بھی موت پر روز زندگی گذارتا رہا۔
مگر جس نے اپنا ذہنی توازن نہیں کھویا۔ جو ایک زلزلہ اور
آغوشِ زمین پہ بھی ثابت قدم رہا۔ جس کے دل میں فرقہ وارانہ
تعصب اور مذہبی اور نسلی نفرت کی ایک چنگاری بھی بھڑک
نہ سکی۔ حالانکہ سارا ارضِ ہمالہ آتشکدہ بنا ہوا تھا۔

کہانی کے ٹکڑے

فوجی جمہوریت

مسجد اور محل

عصمت کا کیا نام ہے ___؟

بھیانک اندھیرے میں

سرخ ستارہ

خوش رہو اہلِ وطن

ارتھ انڈیا سے ایر انڈیا میں

ایک جلوس

پرمٹ

سکینہ زوجہ......

عابد روڈ دلہن بنی ہوئی تھی

بجلی محل لبشیر باغ سے تطاؤس جنرل پوسٹ آفس تک بجلی کے ہزاروں رنگ برنگے قمقمے روشن تھے بیچلرس کوارٹرس منظم جاہی مارکٹ کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے ٹوٹے ہوتے سارے ستاروں کا ڈھیر عابد روڈ پر جمع ہو گیا ہے

عیدوں اور تہواروں کے اس دیس میں ایک نئی عید اور ایک نئے تہوار کا اضافہ ہوا تھا۔ جو ساری عیدوں اور تہواروں سے زیادہ چمکیلی زیادہ رنگیلی اور زیادہ پیاری تھی۔

—— ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء —— پہلے ۱۴ اگست ہر سال آتی تھی۔ مگر دبے پاؤں اندھیرے میں چپ چاپ گذر جاتی تھی پہلے ۱۴ اگست ایک معمولی دن کا نام تھا۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بطن سے جنم لے کر ۱۴ اگست ایک آزاد ملک کی تاریخ کا پہلا صفحہ بن گئی تھی۔

دگ باگ جگمگاتی سڑکوں پر، پرشور ہوٹلوں میں، آراستہ وپیراستہ دوکانوں میں صرف یہ دیکھنے جمع ہوئے تھے کہ ایک غلام ملک کی زمین پر برسوں کے بعد آزادی آئی ہے۔

مگر آزادی کہیں نہیں تھی۔ اجالا ہی اجالا اور روشنی ہی روشنی تھی ——— اور در اصل اجالا ہی آزادی ہے۔ ڈیڑھ سو سال تک ہمارا بدنصیب وطن غلامی اور تیرہ بختی کے اندھیرے میں اندھے کی طرح راستہ ٹٹولتا پھر رہا تھا۔ اس اندھیرے میں گورے قزاق اور سفید چمڑی والے ڈاکو اسے قدم قدم پر لوٹ رہے تھے۔ اس کا سیدھا راستہ تک چرا چکے تھے اس کی منزل پر بھی ناجائز قبضہ کئے بیٹھے تھے، مگر جلیانوالہ باغ سے، کانگرس ہاؤس سے، مسلم لیگ آفس سے، کمیونسٹ پارٹی ہیڈکوارٹرس کی بلڈنگ سے وطن کے جو بہادر جیالے بیٹے باہر نکلے تھے۔ انہوں نے گورے ڈاکوؤں کا ہر جگہ بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے اپنے لہو سے رات کی سیاہی دھونی شروع کی۔ اپنی ہڈیوں سے اندھیرے کو کھرچنا شروع کر دیا۔ اپنے چہروں کی چمک اور درخشندگی دے کر ایک نیا سورج بنایا ——— جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو افق ہمالہ سے طلوع ہوا جس کی تمازت کی تاب نہ لا کر ٹھنڈے ملکوں کے گورے قزاق سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے۔

ہندوستان آزاد ہوا

پاکستان وجود میں آیا

اور حیدرآباد ——— ؟

عابد روڈ پر "آزاد حیدرآباد زندہ باد" ——— "ہز مجسٹی شاہ عثمان زندہ باد" کے نعروں سے سارا حیدرآباد گونج رہا تھا۔

حیدر آباد بھی آزاد ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہز مجسٹی جارج ششتم نے براہ کرم خسروانہ حیدر آباد کو بھی آزاد فرما دیا تھا اور دکن ریڈیو سے ابراہیم جلیس ایک تقریر نشر کر رہا تھا —— ٹکڑے دیس کی تین مملکتیں —— حیدر آبادی مسلمان بہت خوش تھے کہ حیدر آباد بھی آزاد ہو گیا۔ حیدر آبادی ہندو دلگیر تھے۔ کہ حیدر آباد راشٹر یہ بھارت سے کیوں الگ کر دیا گیا۔ حیدر آبادی کمیونسٹ کہہ رہے تھے کہ یہ کیسی آزادی ہے جس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں۔ جو لہو لہان ہے۔ زخمی ہے۔ یہ ماؤنٹ بیٹن پلان ہماری ساڑھ سالہ محبت سے پروان چڑھی عروس آزادی کی موت کا پروانہ ہے۔ جان بل نے حیدر آباد کو، جوناگڈھ کو، ٹراونکور کو اسی لئے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ گورے قزاقوں اور سمندر پار کے ڈاکوؤں کو چھپنے کے لئے کمین گاہیں مل جائیں۔

حیدر آباد آزاد نہیں ہوا بلکہ آزاد سرزمین پر سامراجی ڈاکوؤں کا ایک قلعہ تعمیر ہوا ہے

ہز مجسٹی یار وفادار

جب چالیس کروڑ انسان ڈیڑھ سو سالہ اندھیرے سے آزادی کے اجالے میں آئے تو جان بل گھبرا گیا۔ اس نے ماؤنٹ بیٹن کو آنکھ ماری۔ اور ماؤنٹ بیٹن نے چالیس کروڑ انسانوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ اور بھاگنے لگا۔ چالیس کروڑ انسانوں نے دیکھا کہ انگریز بھاگ رہا ہے۔ حالانکہ یہ محض شعبدہ تھا۔ انگریز نہیں بھاگا۔ بلکہ اس کی پرچھائیں بھاگی — انگریز تو حیدر آباد میں، کشمیر میں، جوناگڈھ میں، اور پھر دہلی اور کراچی، کلکتہ اور ڈھاکہ، لاہور اور بمبئی، پشاور اور مدراس کے اونچے اونچے محلوں، بڑی بڑی بلڈنگوں میں چھپ گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے برلاؤں، ٹاٹاؤں، ڈالمیاؤں

اصفہانیوں، ممدوٹوں اور دولتانوں نے اسے اپنے اپنے محلوں میں پناہ دی تھی۔ چھپا لیا تھا —— اور جو ماؤنٹ بیٹن باہر رہ گیا تھا۔ اس نے سر پہ گاندھی ٹوپی پہن لی تھی اور ماتھے پر تلک لگا لیا تھا اور گورنر جنرل ہو گیا تھا۔ انگریز اس طرح سے اس ملک سے گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت ماونٹ بیٹن ہو گیا تھا۔

پنڈت ماؤنٹ بیٹن کی جے

قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد

ہز مجسٹی شاہ عثمان ......؟

عابد روڈ معاً پولیس کی سیٹیوں سے گونجنے لگی۔ لوگ باگ سڑک سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر دو رویہ چپ چاپ ساکت وصامت کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ کنگ کوٹھی سے اعلیٰحضرت جلالۃ الملک میر عثمان علی خاں روانہ ہو چکے تھے اور مکہ مسجد تشریف لے جا رہے تھے تاکہ شکرانے کی نماز ادا کریں —— کیونکہ کل تک وہ "ہز اگز الٹیڈ ہائی نس" تھے۔ اور آج یک بیک "ہز مجسٹی" بن گئے تھے۔

عابد روڈ پر موت کا سکوت طاری ہو گیا۔ جیسے حضور نظام کی سواری نہیں آ رہی ہو بلکہ موت کی سواری آ رہی ہو۔

اچانک ایک کالی موٹر کار جو شاندار رولس رائس تھی، سڑک پر رانگ سائڈ فراٹے بھرتی آئی —— (بادشاہ اور شہنشاہ بالعموم رانگ سائیڈ ہی چلتے ہیں۔ بادشاہ اور شہنشاہ کا اس سائیڈ پر چلنا شاہی توہین ہے) لوگوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے "محبوب" بادشاہ کو دیکھا۔ جو "ہز مجسٹی" ہونے کے باوجود بغیر پھندنے کی سیاہ میلی رومی ٹوپی اور سیاہ اچکن

پہنے، سیاہی کا مجسمہ بنے ایک لمحہ کے لئے نظروں کے آگے آیا اور سیاہی بکھیرتا ہوا اوجھل ہو گیا۔ ایک شاہ پرست بوڑھے نے زیارتِ شاہ سے مسرور ہو کر ایک شعر باآوازِ بلند پڑھ دیا۔

عثمان غنی سے وہ ہر بات میں ملتے ہیں
دربار رئیسانہ اطوار فقیرانہ

اس وقت میر حسن اینڈ سنز کی دوکان کے پاس ایک بوڑھا کتا بھی بھونک رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد پولیس کی سیٹیاں پھر سنائی دینے لگیں۔ جیسے خطرے کا آلارم بجتا ہو خطرہ آرہا تھا۔ سواری شاہ مکہ مسجد سے واپس ہو رہی تھی۔ نظامس جنرل پوسٹ آفس کے سامنے بیچ سڑک پر بجلی کے قمقموں اور جھنڈوں کا ایک شجر بنایا گیا تھا۔ جس میں بجلی کے چھوٹے چھوٹے بلب انگور کے خوشوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اور اوپر بجلی کے قمقموں سے حروف بنائے گئے تھے۔

ہز مجسٹی شاہ عثمان زندہ باد

یہاں پر مجاہدِ اعظم سید قاسم رضوی، مجلس اتحاد المسلمین کے دیگر ذمہ دار لیڈر اور بڑے بڑے نواب اور جاگیردار، سرکاری عہدہ دار اور بڑے بڑے تاجر اور سوداگر دست بستہ کھڑے تھے کیونکہ یہاں شاہ عثمان کی سواری چند لمحوں کے لئے رکنے والی تھی۔ اور شاہ عثمان تاجرانِ حیدرآباد کا جمع کردہ "کیسۂ زر" بطور نذرانہ وصول کرنے والے تھے۔

نذرانے وصول کرنا حضور نظام کی سب سے بڑی ہابی ہے۔ وہ جس آدمی کو بھی اپنی بارگاہ میں باریاب کرتے ہیں اسے کم از کم حضور کی خدمت میں ایک سونے کی اشرفی ضرور بطور نذرانہ گزارنا پڑتی ہے۔ اس طرح "حضور اقدس" کی روزانہ آمدنی کم از کم پانچ

سونے کی اشرفیاں" ہیں۔ اور حضور اقدس نے اس طرح اتنی دولت اکٹھی کی ہے کہ وہ دنیا کے چار امیر ترین انسانوں میں سے ایک ہیں۔ سنا ہے کہ وہ اپنی دولت موٹر گراج میں رکھتے ہیں۔ آٹھ لاریوں میں سونے چاندی کی اینٹیں اور سکّے اتنی تعداد میں رکھی ہیں کہ لاریوں کے بغیر ٹائیر والے پہیّے زمین میں دھنس گئے ہیں۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام کی کنگ کوٹھی مبارک میں صرف تین چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ دولت ۔۔۔۔ ساڑھے تین سو عورتیں جو کبھی ان کی پیاری رعایا کی بہو بیٹیاں تھیں مگر کمبخت اتنی خوبصورت تھیں کہ حضور نظام کے "حرم" کے سوا کوئی اور جگہ ان کے لئے اس وسیع و عریض کرۂ ارض پر تھی ہی نہیں ۔۔۔۔ حضور نظام نے اپنی عزیز رعایا کی بہو بیٹیوں کو صرف ایک ایک بار اپنے جسم سے سرفراز فرمایا اور کنگ کوٹھی کی اونچی اونچی دیواروں میں جوانی کی آگ میں جلنے اور جھلسنے کے لئے ہمیشہ کے لئے قید فرما دیا۔

وہ شاہ پرست نمک حلال بوڑھا جو میرے پاس کھڑا تھا مسلسل بکے جا رہا تھا۔

واہ وا ۔۔۔۔ کیا عالی مقام انسان ہے ہمارا بادشاہ۔ اتنا دولت مند، اتنا پر وقار مگر جب محل میں ہوتا ہے تو صرف ایک تہمد اور ایک بنیان پہنے رہتا ہے ۔۔۔۔ شاہی لباس تو صرف ایک ہی بار پہنا تھا ۔۔۔۔ اس کے مقابلے میں ہمارے لڑکوں کو دیکھو۔ کالج میں پڑھتے ہیں۔ باپ کوڑیاں کماتا ہے اور بیٹے لاٹ صاب بنے پھرتے ہیں ۔۔۔۔ ایک اپنے بادشاہ کو بھی دیکھو۔ ابھی میں کہتا ہوں ؟ چار مینار" سگریٹ پیتا ہے۔ تین پیسے میں دس سگریٹ . . . .

میں نے عمداً جیب سے گولڈ فلیک کا پیکیٹ نکالا۔ اور ایک سگریٹ جلایا
بوڑھا اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا۔

—— ذرا ان میاں صاحبزادے کو دیکھنا، . . . .

میں اس بوڑھے سے باضابطہ طور پر الجھ جانا چاہتا تھا لیکن پولیس کی سیٹیوں کا شور بڑھ گیا تھا۔ اور حضور نظام کی سواری وہاں پہنچ چکی تھی جہاں مجاہد اعظم سید قاسم رضوی اور دوسرے لوگ ان کے منتظر تھے۔

مرکب شاہانہ جوں ہی رکی۔ مجاہدِ اعظم اور سب لوگ حالت رکوع میں شاہی سلام بجا لائے۔ حضور پرنور نے کرخت اور بھرّائی آواز میں پوچھا۔

"قاسم —— تو اچھا ہے —"

مجمع میں ہمارے قریب ایک قصائی بھی کھڑا تھا۔ جو "ارے نزے" اور "تو نکا" بولنے میں بڑا مشہور تھا۔ مجمع میں شاہی فوٹو گرافر بھی تھے۔ جو پہلے حضور والا کے آگے جھک کر فرشی سلام بجا لاتے تھے اور شبیہ مبارک کی تصویر کھینچنے کی عزت حاصل کرتے تھے عابد روڈ کے سب سے بڑے تاجر نے آگے جھک کر بڑے ادب سے کیسۂ زر حضورِ اقدس کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور نے اس پر ہاتھ رکھا اور حضور کے پیش کے چپڑاسی نے وہ کیسۂ زر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد حضور نظام کی کار تیزی سے فراٹے بھرتی چلی گئی۔ مجمع نعرے لگانے لگا۔

ہز مجسٹی شاہ عثمان زندہ باد

اس طرح بجلی کے قمقموں سے بنائے ہوئے "دن" نے حیدر آباد کے تاجروں نے

اور حیدر آباد کی جاہل رعایا نے۔ اُن کی آن میں شاہ عثمان کو "ہز مجسٹی" بنا دیا تھا۔ مجاہد اعظم قاسم رضوی نے حیدر آباد ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے اعلیٰحضرت اور شہزادگان اور شہزادیوں کی درازیٔ عمر و اقبال کی دعا کی اور باشندگان ریاست حیدر آباد کو مبارک دی کہ آج ہم انگریزی اور برہمنی اقتدار سے بالکل آزاد ہو چکے ہیں۔

حیدر آباد پر پھر رات بڑھتی جا رہی تھی۔

اور دکن ریڈیو سے "ترانۂ دکن" بج رہا تھا۔

تا ابد خالقِ عالم یہ ریاست رکھے
تجھ کو عثمان بصد اجلال سلامت رکھے

جنوبی پاکستان

بڑھتی ہوئی رات کو اور طول دینے اور عثمان کو بصد اجلال تا ابد قائم رکھنے کے لئے لندن میں ٹوڈی اخبار مانچسٹر گارجین نے ایک اداریہ تحریر کیا۔ مشہور جنگ باز لیڈر مسٹر ونسٹن چرچل نے پارلیمنٹ میں سگار کا دھواں اڑاتے ہوئے حیدر آباد کی آزادی اور خود مختاری کی پرزور حمایت کی۔ ملک معظم کی حکومت نے سر والٹر مانکٹن جیسے "نیک نام" سامراجی ڈگ کو حضور نظام کا مشیر قانونی مقرر فرمایا اور حیدر آباد بھیج دیا ——— حضور نظام کے حوصلے بڑھ گئے۔ آخر کو حضور نظام ملک معظم کے "یار وفادار" تھے ان کے آباؤ اجداد نے اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے ایک غیر ملکی سامراج کے قدم اپنے وطن کی زمین پر مضبوط کئے تھے۔ تو پھر حضور نظام ایسے آڑے وقت میں جبکہ ہندوستانی

محبانِ وطن ان کے کرمفرما اور محسن کو ہندوستان سے بھگا رہے تھے ـــــ کیسے مدد نہ کرتے۔ حق نمک کیوں نہ ادا کرتے۔ وفاداری کی آزمائش کا وقت آگیا تھا ـــــ شیر دل ٹیپو نے ایک بار پھر انگریزوں کا ٹینٹوا پکڑ لیا تھا۔ اور حضورِ نظام نے بہ پاسِ وضعداری روایاتِ خاندانِ آصفیہ کے تحفظ کی خاطر سرنگاپٹم کی کمان کے بیچوں بیچ ہندوستان کو دوبارہ گرادیا۔

۱۵ ر اگست کی صبح رہبر دکن، میزان، صبح دکن، پیام، نظام گزٹ اور دوسرے سارے مقامی اخبارات کے پہلے صفحے پر حضرتِ اقدس حضورِ نظام کے فرمان مبارک شائع ہوئے کہ

"بحمد اللہ حیدر آباد اب بالکل آزاد و خود مختار ہے میں اپنی حکومت کو نہ ہندوستان میں شامل کرنا چاہتا ہوں اور نہ پاکستان میں ـــــ بلکہ میں ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتوں سے باعزت برابر دوستانہ اور حلیفانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہوں"

لیکن حضورِ نظام کی رعایا نے ذہنی طور پر حیدر آباد کو بھی تقسیم کر ڈالا تھا۔ ریاست کے ۲۵ لاکھ مسلمانوں نے حیدر آباد کو پاکستان میں شامل کر دیا تھا اور ایک کروڑ پچاس لاکھ غیر مسلم رعایا نے حیدر آباد کو ہندوستان میں شریک کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ مسلمان ریاست کا حکمران طبقہ تھے۔ اس لئے حیدر آباد بظاہر پاکستان ہی نظر آتا تھا۔ بلکہ بعض حیدر آبادی تاجروں نے اپنی اپنی دوکانوں کے اشتہارات رہبر دکن، میزان اور نظام گزٹ میں یوں شائع کروائے تھے:۔

جنوبی پاکستان کی ساری مصنوعات

کے لئے

ہماری خدمات حاصل کیجئے

حاجی دادا جنرل مرچنٹس پتھر گٹی حیدر آباد

حیدر آباد جنوبی پاکستان ایسے ہی بن گیا تھا جس طرح وہ آزاد و خود مختار ہو گیا تھا جس طرح حضرت شیخ چلی نے بغداد کے بازار میں شیشے کے برتن بیچتے بیچتے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

حیدر آباد میں بھی ہندوستان اور پاکستان کی طرح انتظامِ سلطنت نئے انداز میں شروع ہوا۔ حکومت میں مسلمانوں کا بڑا زور تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین کی رہنمائی میں مسلمانوں کی ایک عسکری تنظیم چل نکلی تھی۔ جس کے رہنما مجاہد اعظم سید قاسم رضوی صدر مجلس اتحاد المسلمین تھے۔ مجاہدِ اعظم نہ صرف اتحاد المسلمین کے صدر تھے بلکہ حکومت حیدر آباد کے تھے۔ حضور نظام صرف افیم کھایا کرتے تھے۔ فارسی اشعار لکھا کرتے تھے۔ ہر شام اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی فرمان مبارک جاری کرتے تھے۔ فرمان جو کثرتِ اشاعت سے واجب التعظیم زیادہ اور واجب التعمیل کم تھے۔ حکومت کی لگام ہی باگ ڈور مجاہدِ اعظم کے ہاتھ میں تھی۔

اب وزارتِ عظمیٰ کا مسئلہ درپیش تھا۔ نواب صاحب چھتاری کے تشریف لے جانے کے بعد وزارتِ عظمیٰ کی کرسی خالی تھی اور کوئی اس کرسی پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کیونکہ

سب کے سامنے نواب صاحب چھتاری کا حشر کھڑا ان کے قدم روک رہا تھا ——— کیونکہ مجاہدانِ حیدرآباد نے ایک بار ابھی نواب صاحب چھتاری کی مونچھیں پکڑ کر (واللہ اعلم بالصواب) مار اپیٹا تھا کیونکہ مجاہدین کا خیال تھا کہ نظام آباد کی مسجد ڈچ پلی کو شہید کر کے گرجا بنا دینے میں نواب صاحب معز وزیر مال آنریبل ڈبلیو گرگسن اور کلیسائے ڈچ پلی کے بڑے پادری کے ساتھ سازش میں شریک تھے ——— اس کے بعد پھر نواب صاحب موصوف نے محض حضور نظام سے والہانہ عقیدت کے باعث دوبارہ صدارتِ عظمیٰ قبول فرمالی تھی لیکن بعد میں مسلم عوام کو پتہ چلا کہ وزیر اعظم بہادر "ہندو نواز" ہیں اور وہ حیدرآباد کو حکومتِ ہندوستان کا غلام بنانا چاہتے ہیں اس لئے کہ ان کی ساری جائیداد علی گڑھ میں تھی اور وہ خود ہندوستانی حکومت میں کوئی اعلیٰ عہدہ حاصل کرنا چاہتے تھے چنانچہ ایک رات وہ چپ چاپ دہلی جانے والے تھے۔ نظام حیدرآباد نے ان کے کان میں سرگوشی کی تھی اور مجاہدِ اعظم کی عقابی نظروں نے کنگ کوٹھی مبارک کی دیواروں کو چھید کر اس سرگوشی کا منظر دیکھ لیا تھا۔ افواہ مشہور تھی کہ دہلی سے سر سلطان احمد بھی "کچھ" لے کر آئے تھے اور "بہت کچھ" لیجارہے تھے

رات کے چار بجے جب نواب صاحب چھتاری کا چارٹرڈ ہوائی جہاز حکیم پیٹھ کے ہوائی اڈے سے اڑنے ہی والا تھا کہ مجاہدِ اعظم کی آواز حیدرآباد کی فضاؤں میں گونجی۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مجاہدِ اعظم کے جانثار گہری نیندوں سے جاگ پڑے۔ دارالسلام میں جمع ہوئے۔ سڑکوں پر پھیل گئے۔ اور پھر حکیم پیٹھ کے ہوائی اڈے کا محاصرہ کر لیا۔

نواب چھتاری کا ہوائی جہاز نہ اڑ سکا۔ سازش پروان نہ کہ سکی۔ مجاہد اعظم جیت گئے۔ نواب صاحب چھتاری ہمیشہ کے لئے حیدر آباد سے چلے گئے۔

پرمٹ گورنمنٹ

وزارت عظمیٰ کی خالی کرسی اخباروں اور ہوٹلوں کا موضوع بن گئی تھی۔

"سر مرزا اسماعیل آرہا ہے"

"وہ نہیں آسکتا۔ وہ ہندو نواز ہے"

"علی یاور جنگ وزیر اعظم بنے گا"

"وہ بھی کانگرسی ہے"

"دیکھو جناح صاحب کیا حکم دیتے ہیں"

لوگ کراچی کی طرف نظریں جمائے دیکھ رہے تھے ——— افواہ اڑی

"میر لائق علی آرہے ہیں"

"جناح صاحب نے میر لائق علی کو حکم دیا ہے کہ وہ امریکہ سے فوراً حیدر آباد پہنچ جائیں"

افواہ کی تصدیق ہو گئی اور سرکاری توثیق بھی ہو گئی۔ میر لائق علی وزیر اعظم بن گئے۔ مسلمان بیحد خوش ہو گئے۔ میر لائق علی حیدر آباد کے "راک فلر" تھے کروڑپتی تھے۔ اور عام کروڑپتیوں کی طرح بڑے اللہ والے بھی تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جب بھی یہ اپنے محل سے باہر نکلتے تھے تو برآمدے کے دو ستونوں پر شہادت کی انگلی سے ایک پر اللہ دوسرے

پر محمد لکھتے تھے۔ تب کہیں برآمد ہوتے تھے۔

میر لائق علی کی حیدرآباد میں کئی فیکٹریاں تھیں "سرپور پیپر ملز" انہی کے تھے" بودھن شوگر فیکٹری" انہی کی تھی۔ اور کئی ملوں اور فیکٹریوں میں ان کے بڑے بڑے حصے تھے۔ بلکہ سارا حیدرآباد ان کا تھا۔ اور اب وہ وزیر اعظم تھے۔

حضور نظام نے تازہ فرمان کے ذریعے انہیں اپنی وزارت تشکیل دینے کا حکم دے دیا۔ میر لائق علی نے حکومت حیدرآباد میں بسنے والی رعایا کے ہر طبقے کی جائز و ناجائز نمائندگی کے لئے ہندوؤں لنگائیتوں اور اچھوتوں کو بھی دعوت دی۔

ہندوؤں، لنگائیتوں اور اچھوتوں میں بھی بہت سے حضور نظام الملک آصف جاہ کے وفادار اور نمک حلال جاگیردار اور زمیندار تھے۔ چنانچہ راجہ نیگل ونکٹ راما ریڈی جو پہلے سے نائب وزیر اعظم تھے۔ اپنے عہدہ پر اس لئے باقی رہے کہ راجہ تھے۔ جاگیردار تھے۔ سرمایہ دار تھے۔ لنگائیتوں کی جانب سے آنریبل مسٹر جوشی وزیر مقرر کئے گئے۔ لپست اقوام اور اچھوتوں کی طرف سے عزت مآب بی۔ ایس۔ ونکٹ راؤ وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ بقیہ نشستوں پر اتحاد المسلمین کے لیڈروں نے قبضہ کر لیا۔

اس طرح جاگیردار، سرمایہ دار اور مالدار ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ "عوامی وزارت" قائم ہوگئی۔ اور یہ عوامی حکومت مجاہد اعظم سید قاسم رضوی اور مجلس اتحاد المسلمین کے کلیتہً قبضہ و اختیار میں تھی۔

عوامی وزارت کے تشکیل پاتے ہی حیدرآبادی عوام کو معلوم ہوگیا کہ اتحاد المسلمین کی لیڈری علاؤالدین کا چراغ ہے۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے کل کے دکیلوں کو آج وزیر بنا دیا تھا۔ اس عوامی

وزارت کے چار وزیر پہلے معمولی "وکیل" ہی تھے ۔مسٹر یامین زبیری ،مسٹر عبدالرؤف ،مسٹر عبدالرحیم اور مسٹر اکرام اللہ یہ چاروں بیچارے وکیل ہی تھے لیکن آسمان سے بڑی "دروازہ قسمتیں" لکھوا کے لائے تھے۔ کل تک وکالت چلتی نہیں تھی۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے وزارت . . . . .

ان میں ایک وزیر مسٹر عبدالرحیم کے ساتھ ایم اسلم علیس بھی ایک بار حیدر آباد سے ٹانڈور اسٹیشن تک ریل کے ایک تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں ہمسفر رہنے کی عزت حاصل کر چکا تھا۔ موصوف یا عزت مآب کسی مقدمے کے سلسلے میں حیدر آباد سے ٹانڈور تشریف لے جا رہے تھے لیکن اب وزیر موصوف کے محل کے آگے ایک "ملمن" اور ایک "اسٹڈی بیکر" کھڑی تھی۔ اسٹڈی بیکر میں وزیر موصوف اضلاع کے دورے فرماتے تھے۔ اور "ملمن" میں وزیر موصوف کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادگان تفریح فرماتے تھے۔

آنریبل مسٹر عبدالرؤف وزیر تعمیرات کیا ہوئے تھے کہ ان کے دس گیارہ سال کی عمر کے صاحبزادے دن بھر سرکاری "کار" ڈرائیو کرتے حیدر آباد کی سڑکوں پر گھوما کرتے تھے ——

ایک دن وہ کالج اسی لئے تشریف نہیں لے گئے کہ "کار" کچھ خراب ہو گئی تھی۔

سارے وزراء اپنے بوسیدہ "وکالت خانوں" کو کرائے پر اٹھا کر "سرکاری محلوں" میں منتقل ہو چکے تھے۔ صرف عزت مآب مولوی یامین زبیری نے اپنا گھر نہ چھوڑا اس لئے کہ وزیر ہر جا کہ نشیند وزیر است۔ لیکن ان کے گھر بڑی چہل پہل تھی۔ باہر ملاقاتیوں غرضمندوں اور خوشامدیوں کا ہجوم لگا رہتا تھا اور اندر اہل غرض حضرات کی "بیبیاں" بیگم صاحبہ سے ملاقات کی عزت حاصل کرنے تانتا باندھ دیتیں۔

جس دن "عزت مآب" یامین زبیری صاحب کے وزیر مقرر کئے جانے کی خبر سرکاری

طور پر آئی۔ اس دن "عزت مآب" کے صاحبزادے گھر میں ناچنے کودنے لگے کہ

ابّا جان ——— بادشاہ ہو گئے

ابا جان ——— بادشاہ ہو گئے

"عزت مآب" کو غصہ آیا تو انھوں نے ایک بچہ کو پکڑ کر پیٹنا شروع کیا۔ بیگم صاحبہ نے بیچ بچاؤ کیا اور کہا:

"بچے کو کیوں مارتے ہیں آپ ——؟ معصوم بچے کی زبان مبارک ہوتی ہے آج وزیر ہوئے ہو کل بادشاہ بھی ہو جاؤ گے۔"

معلوم نہیں یہ واقعہ سچ ہے یا جھوٹ۔ اگر سچ ہے تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ عزت مآب بیگم صاحبہ کے اس جواب سے اور زیادہ غصہ ہوئے یا اور زیادہ خوش ہوئے۔ بہرحال یہ تو ایک واقعہ ہے کہ لوگ باگ عام پبلک مقامات پر عوامی وزراء کے بارے میں ایسے ایسے ہی دلچسپ واقعات سنانے لگے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حیدرآبادی عوام "جمہوریت" سے واقف نہیں تھے۔ اور جمہوری حکومت کے اراکین کی عزت سے ناآشنائے محض تھے انہیں صرف یہی تکلیف تھی کہ وہ ایک معمولی وکیل کو وزیر بنا دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ انگلستان میں ایک کسان کا بیٹا ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم بن گیا تھا۔ مسولینی ایک لوہار کا بیٹا تھا۔ ہٹلر ایک کارپینٹر کا نور چشم تھا۔ جمہوریت کے ضمن میں میں نے مسولینی اور ہٹلر کا نام اسی لئے پیش کیا ہے کہ حیدرآباد میں بھی تقریباً وہی "جمہوریت" قائم ہوتی تھی جو جرمنی اور اٹلی میں حکمران تھی۔

ان عوامی وزراء کے برسر اقتدار آتے ہی عوامی وزراء کے بھائی بند، عزیز رشتہ دار،

یار دوست بڑے خوش ہو گئے بلکہ بعض لوگ خواہ مخواہ بغیر کسی رشتے کے ڈینگیں مارا کرتے تھے کہ فلاں وزیر میرے بھائی کا بہنوئی یا چچا کا خالو یا خالو کا ماموں وغیرہ وغیرہ ہے تمہیں اگر کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ یوں چٹکیوں میں کرا دوں۔

خود عوامی وزراء نے پہلے اپنے بھائی بند، عزیز رشتہ داروں اور گہرے دوستوں کو ہر قسم کا "عوامی فائدہ" پہنچایا۔ عزت مآب یامین زبیری نے وزارت کا جائزہ لیتے ہی اپنے سگے چھوٹے بھائی مسٹر تحسین زبیری کو جو میٹرک پاس بھی نہیں تھے کمرشل کارپوریشن میں ضلع کارپوریشن افسر بشاہرہ تین سو تا چھ سو مقرر کر دیا۔

"اقربا پروری" اس زور شور سے شروع ہوئی کہ حکومت کی ساری بڑی اور چھوٹی کرسیوں پر کوئی عزت مآب عبدالرؤف کا کوئی آنریبل عبدالرحیم کا، کوئی مولوی یامین زبیری کا عزیز ہے رشتہ دار ہے، بھائی ہے، بھتیجا ہے، بھانجا ہے، سالا ہے، داماد ہے، وغیرہ وغیرہ ہے۔

جن رشتہ داروں اور دوستوں کے لئے حکومت کی کرسیاں حاصل نہ کی جا سکیں ان کے لئے تجارت کا بازار گرم تھا۔ اسی لئے مجھ جیسے بدطینت لوگ اس عوامی حکومت کو "پرمٹ گورنمنٹ" بھی کہنے لگے۔ پرمٹ بازی وہ چلی کہ میاں عبدالعزیز جو پہلے سرکاری راشن کی ایک دکان کے مالک تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خانصاحب میاں عبدالعزیز" بن بیٹھے جواب سرکاری محکموں میں کرائے کی سائیکل پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی کار "فی ایٹ لیٹسٹ ماڈل برانڈ نیو کار میں تشریف لے جاتے تھے بڑے بڑے افسروں کو بڑی بڑی رشوتیں دیتے تھے اور بڑے بڑے "پرمٹ" حاصل کرتے تھے اب نہ وہ ہلال اسلام ہوٹل" کے مقروض تھے! اور نہ عبدالنبی پان سگرٹ مرچنٹ

ان سے اپنے پرانے قرض چار روپے تیرہ آنے کا مطالبہ کرتا تھا بلکہ وہ بھی مونگ پھلی اور ڈالڈا یا شکر کا پرمٹ بنانے کے لئے میاں عبدالعزیز کی خوشامدیں کیا کرتا تھا۔ کیونکہ میاں عبدالعزیز کے سہارے عوامی وزراء تک رسائی بہت آسان تھی۔

لوگ جوق در جوق اتحادالمسلمین کے قریب آنے لگے کیونکہ اتحادالمسلمین کے پاس حکومت کی کرسیاں تھیں۔ بزنس کے پرمٹ تھے۔ بیرونی ممالک کے سفر کے ٹکٹ تھے راشن کی دوکانیں تھیں۔ کپڑے کی دوکانیں تھیں کوٹھیاں تھیں۔ گودام تھے۔ فیکٹریاں تھیں۔ کھیت تھے ــــــ مجلس اتحادالمسلمین جو مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم فلاح و بہبود کے لئے قائم کی گئی تھی۔ حرص و ہوس کی دکان بن کر رہ گئی تھی۔ لوگ "کچھ" بننے کی غرض سے پہلے مجلس کے لیڈر بن جاتے تھے۔ اور اس لیڈر شپ کو حاصل کرنے کے لئے۔ حتیٰ کہ محلہ واری لیڈرشپ حاصل کرنے کے لئے امیدوار ایک دوسرے کو جسمانی نقصان بھی پہنچاتے تھے۔ کسی کے سامنے مذہب قوم ملک کچھ نہیں تھا سب کے سامنے اعزاز و مرتبہ تھا سب کے سامنے اپنی منفعت اور اپنی خوشحالی کے خواب تھے لیڈرشپ کے لئے بھی سفارشیں اور رشوتیں چلتی تھیں لیڈرشپ کے لئے کسی خاص خصوصیت کی ضرورت نہیں تھی جو شخص ذرا بھی چلتا پرزہ ہے وہ لیڈر بن سکتا ہے جو زرا بھی بے ایمان ہے وہ لیڈر بن جاتا تھا بے ایمانی اور لیڈری بے ایمانی اور زرداری ــــــ عوامی حکومت "یہ" کام کر رہی تھی۔ ایسے سب کام جنہیں کام کہنا کام جیسے قابل قدر فعل کی توہین ہے۔

اس عوامی وزارت کے تشکیل پا جانے یا اس عوامی حکومت کے برسرِ اقتدار آجانے

کے بعد حیدرآباد بھی انگلستان کی طرح ایک ایسی جمہوری حکومت بن گیا تھا جہاں جمہوریت اقتدار شاہی کے زیر اثر ہوتی ہے۔ حیدرآباد میں بھی انگلستان کی طرح شاہی جمہوریت یا امپریل ڈیموکریسی مسلط ہو گئی تھی۔

مجاہد اعظم تقریروں میں تحریروں میں صحافتی بیانات میں ریڈیو پہ، پبلک جلسوں میں یہی کہتے تھے:

"اعلیٰ حضرت جلالت الملک ہمارے اقتدار اعلیٰ کے مظہر ہیں۔ اور ہم اس اقتدار اعلیٰ کے زیر سایہ ایک آزاد اور پرامن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم حیدرآباد کے ہندو مسلمان اور پسپت اقوام پہلے حیدرآبادی ہیں۔ بعد میں ہندوستانی یا پاکستانی۔ ہم حیدرآبادی ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی اور اچھوت زیر سایۂ عاطفت سلطنت آصفیہ سات سو سال سے برادرانہ امن و شانتی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم ایک کروڑ چھتر لاکھ حیدرآبادی اپنی اس ارضی جنت اور امن و تہذیب کے اس گہوارے کو ہندوستان اور پاکستان کے جہنم زاروں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے۔ . . . . آج جبکہ ہندوستان اور پاکستان کے ہر بڑے شہر کو فرقہ وارانہ فسادات نے آگ اور خون کا جہنم بنا رکھا ہے اس ریاست ابد مدت میں ایک بھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا ہے ـــــ للہ الحمد کہ حیدرآباد کی پیشانی پر انسانی خون کا ایک چھینٹا بھی نہیں ہے . . . .

زہر کے تاجر

مجاہدِ اعظم کا یہ دعوےٰ ایک حد تک سچ بھی تھا۔ اس وقت جب کہ دہلی جل رہی تھی امرتسر جل رہا تھا۔ لاہور جل رہا تھا۔ حیدرآباد واقعی ایک ارضی جنت بنا ہوا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوستان اور پاکستان سے انسانیت کا جنازہ اٹھ چکا ہے اور تاریخ کے اندھیرے ادوار کے آدم خور حیوان جو انسان کی پیدائش سے ڈر کر پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ گئے تھے۔ اب پھر برسوں کے بعد باہر نکل آئے ہیں اور انسانی لاشوں کی دعوت اڑا رہے ہیں۔

فسادات کے دور میں حیدرآبادیوں کو تصویر کا ایک ہی رخ نظر آتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حیدرآبادی خبروں کے لئے صرف رہبر دکن، میزان، وقت اور نظام گزٹ کے محتاج تھے۔ یہ تینوں اخبار کٹر اور متعصب مسلمان سرمایہ داروں کے اخبار تھے۔ ان اخباروں میں صرف یہ خبریں شائع ہوتی تھیں کہ دہلی میں کتنے مسلمان مارے گئے۔ امرتسر میں کتنی مسلمان عورتوں کے ننگے جلوس سربازار گشت کرائے گئے۔ پٹیالہ، الور اور گوالیار میں کتنے مسلمان شہید ہوئے، مشرقی پنجاب میں کتنے مسلمان مارے گئے۔

ان خبروں کی اشاعت سے نہ صرف اخبار ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتے تھے بلکہ فرقہ پرستی اور تعصب کا زہر بھی حیدرآبادی مسلمان کے خون میں رستا بستا جا رہا تھا۔

یہ اخبارات اور ان کے سرمایہ دار ایڈیٹر محمود وحید الدین، عبدالرحمٰن رئیس، غلام محمد

کلکتے والا (جو تجارت کی غرض سے حیدرآبادی شہری بن گیا تھا)

اور وقار احمد یہ دراصل مذہب کے تاجر تھے۔ جنہوں نے فرقہ پرستی کا زہر بیچ کر لاکھوں روپیہ کمایا۔

ان اخبارات نے شمالی ہندوستان کے "ہندو" اور "سکھ" کو ایسی بھیانک شکل میں پیش کیا کہ حیدرآبادی مسلمانوں کے دل میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف نفرت کا بے پناہ جذبہ امڈ آیا۔ اچھے اچھے صحیح الدماغ اور ذہین لوگ جو "انسانیت" میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے ذہن بھی ڈانواڈول ہو گئے۔ فرقہ پرستی کا زہر اپنا کام کر چکا تھا اور ابراہیم جلیس بھی اس زہر سے نیلا پڑ گیا۔ ابراہیم جلیس جو پہلے ارضِ ہمالہ کے ذہین ترقی پسند انسانوں کے قافلے کا ایک رکن تھا۔ جو اس مذہب کا پیرو تھا جس کا نام انسانیت ہے۔ انسان پرستی کے راستے سے ہٹ کر فرقہ پرستی کے کھڈ میں گر گیا۔

اور جس دن میں نے یہ سنا کہ میری علی گڑھ کی تشنہ کام محبت بلقیس جہاں کو ماؤنٹ بیٹن پلان نے دہلی سے بھگا کر کٹڑہ جیمل سنگھ امرتسر کے چوک کے بیچوں بیچ مادرزاد ننگا کر دیا ہے اور اکالی سکھوں اور سیوک سنگھی ہندوؤں نے اس کے سرخ و سپید جسم، اس کے بلور جیسے جسم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا میں یک بیک مسلمان ہو گیا۔ غیور مسلمان، غازی مسلمان، مجاہد مسلمان ......

محمد عربی کا مسلمان نہیں بلکہ محمود غزنوی اور طارق کا مسلمان، اسلامی تعلیمات کا پیرو مسلمان نہیں بلکہ منشی صادق حسین اور عبدالحلیم شرر کی ناولوں کا مسلمان۔

میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی آفس سے باہر نکل آیا۔ اور جب اپنے غیر متوازن ذہن اور زہریلے جذبات سے مغلوب ہو کر "دارالسلام" میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت پریم دھون نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکا اور کہا:

نہیں نہیں۔ تمہاری یہ منزل نہیں ہے جلیس۔ یہ مسجد ہے اور یہ جگہ ایک بادشاہ نے تعمیر کی ہے۔ یہاں نہ اسلام ہے اور نہ یہاں خدا رہتا ہے۔ خدا مندر، مسجد اور گرجا میں نہیں رہتا ——— اگر تمہیں خدا ہی کی تلاش ہے تو سنو۔ خدا انسان کے دل میں رہتا ہے۔ آؤ۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ انسان کے دل کی طرف ——— ایک نئی دنیا کی طرف جہاں ایک نیا انسان رہتا ہے ——— دیکھو سیاہی کا ڈیرا گر رہا ہے۔ ہم اندھیرے کے کتنے کڑے کوس طے کر آئے ہیں۔ اب تھوڑا سا اندھیرا اور باقی ہے۔ اتنی دور آ کر کیا تم اندھیرے میں کھو جانا پسند کرو گے ؟

مگر میں نے جھلا کر پوچھا۔

"اور بلقیس جہاں ——— ؟ جو امرتسر کے بازاروں میں ننگی اور بے آبرو کھڑی ہے۔"

میں نے پریم دھون کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑا لیا اور "دارالسلام" میں گھس گیا۔ جہاں مجاہد اعظم تقریر کر رہے تھے:

مسلمانو!

تم خالد [illegible] کی اولاد ہو

تم جمال الدین افغانی کی آنکھوں کے تارے ہو

تم اقبال کے شاہین زادے ہو

تم جناح کے راج دلارے ہو

اٹھو — اور دہلی کی طرف سے بڑھتے ہوئے کفر کا جگر چیر کر رکھ دو۔ اٹھو کہ "فتح مکہ" تمہارے قدم چومنے کے لئے بیقرار ہے۔ اٹھو۔ محمود غزنوی کا بت شکن ارادہ، خالد اور طارق کا دل محمد بن قاسم کی شجاعت، قلندر کی نظر، عبدالرزاق لاری کا لہو اور ٹیپو کی شمشیر لے کر اٹھو۔

یاد رکھو۔ تم انہی اسلاف کی یادگاریں ہو جنہوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے تھے۔ جنہوں نے یورپ کے کلیسا میں اذانیں دی تھیں جنہوں نے سومنات کے بت توڑے تھے۔ جنہوں نے بحر و بر پہ حکومت کی تھی۔ جن کے ایک ایک قدم سے زمین کی چھاتی دہل جاتی تھی

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں

خنجر ہلال کا ہے قومی نشان ہمارا

میری رگوں میں مجاہد بن طرابلس کا لہو کھول گیا۔ اور میں محمود غزنوی کا عزم، خالد کا دل محمد بن قاسم کی شجاعت، عبدالرزاق لاری کا لہو اور ٹیپو کی شمشیر سونتے آگے بڑھا۔ پرچم فضا میں بڑے کروفر سے لہرا رہا تھا اور اندھیرے میں مجھے نظر ہی نہ آیا۔ کہ وہ پرچم کو نسا ہے اور کس کا ہے؟؟

میں بھی زہر کے تاجروں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ میرے عزیز دوست فصیح الدین احمد نے اپنا ہفت روزہ اخبار "پرچم" مجھے دے دیا۔ اور میں نے ہر ہفتہ فرقہ وارانہ تعصب کا زہر بیچ بیچ کر کمایا تو کچھ نہیں، البتہ میرے سفلی جذبات کو بڑی تسکین ملتی تھی کہ میں دہلی، مشرقی پنجاب

گوالیار، الور، بھرت پور، پٹیالہ، بہار، بمبئی، وسط ہند اور کلکتہ کے مظلوم مسلمانوں کا خوب خوب بدلہ لے رہا ہوں۔

میرے مضامین لاکھوں مسلمان پڑھتے تھے۔ میں لاکھوں مسلمانوں کے مجمع میں زہر فشانی کرتا تھا اور لوگ بڑے شوق سے گھنٹوں میری تقریریں سنتے تھے۔

"ابراہیم جلیس زندہ باد"

کے نعرے لگاتے تھے۔ "پرچم" بیچنے والے ہاکر اور اخبارات کے ایجنٹ مجھے بتاتے تھے کہ جب آپ کا کوئی مضمون چھپتا ہے تو لوگ ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے ہیں۔ مسلمان عورتیں "پرچم" خریدنے سے پہلے یہ ضرور پوچھتی تھیں کہ کیا اس میں ابراہیم جلیس کا کوئی مضمون ہے ——؟

بوڑھی عورتیں اور مرد میرے مضامین پڑھ کر زار و قطار روتے تھے۔ اور مجھے دعائیں دیتے تھے۔ لوگ مجھ سے بڑی عزت سے بڑے ادب سے ملا کرتے تھے۔ مجھے جگہ جگہ تقریروں کے لئے دعوت دی جاتی تھی۔

مگر میرے گھر والے مجھ سے ناراض تھے۔ میرے والد محترم میرے ان مضامین کو پسند نہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجھ سے بات کرنا تک چھوڑ دیا تھا۔ میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور میر عابد علی خاں نے مجھے کئی بار متنبہ کیا کہ یہ روش چھوڑ دو —— تم غلط راستے پر جا رہے ہو —— پہلے کی طرح افسانے لکھا کرو۔ یہ کیا "بکواس" لکھ رہے ہو؟

لیکن ان دنوں میں حفیظ جالندھری کے شاہنامہ اسلام کا ایک شعر اکثر گنگنایا کرتا تھا۔

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں

میں قلم ہاتھ میں لے کر بڑی مستعدی سے خدمتِ اسلام کرنے لگا میرے اطراف میرے گھرے دوست نظر حیدر آبادی، شاہد صدیقی، تحسین سروری، خواجہ معین الدین اور مسلم ضیائی تھے۔ جو ابھی تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن تھے یعنی فرقہ پرستی کے قائل نہیں تھے میں نے آہستہ آہستہ انہیں بھی ہموار کرنا شروع کیا۔ مجھے اپنی اور ان کی دوستی پہ یقین تھا کہ وہ میرے اثر میں آجائیں گے۔ میں دن بدن انہیں قریب لاتا گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے متوازی ایک اور انجمن — "انجمن مسلم مصنفین" قائم کر دوں۔ جو بعد کو صرف "انجمن مصنفین" کے نام سے مجلس اتحاد المسلمین کی سرپرستی میں قائم ہوئی۔ جس کے لئے مجلس نے ایک شاندار کوٹھی دفتر کے لئے دے دی۔ جہاں میں اور میرے احباب دن بھر تاش شطرنج کیرم اور والی بال کھیلتے تھے۔

یہ انجمن مصنفین گویا مجلس اتحاد المسلمین کے پروپیگنڈا ڈپارٹمنٹ کی ایک شاخ تھی جہاں حیدر آباد کے بہترین ذہین دماغ میری وساطت سے میری دوستی میں بہک کر جمع ہو گئے تھے۔ نظر حیدر آبادی، شاہد صدیقی، تحسین سروری، خیرات ندیم، تاج شہریار، رونق ظہیر، پروفیسر منظور حسین شور، افضل عابدی، اثر مجیدی، خواجہ معین الدین، عبد الرزاق لاری، احمد عبد القیوم، احمد مکی۔ محمود عبد الماجد، طاہر عبد الباسط، عزیز جاوید، یوسفی، عرش حیدری، بشارت اللہ بیگ، صدیق بیگ، ریاض خرشوری، مصطفےٰ علی، ع احمد، مختار کرمانی، شفیع اختر مرزا اظہر الحسن، اشفاق حسین، یوسف ناظم، ثنا اللہ، اوصاف علی عباسی اور دوسرے میرے

بہت سے ہمنوا میری خاطر اس انجمن سے وابستہ ہو گئے۔

انہی دنوں پروفیسر عزیز احمد پاکستان اور کشمیر کے دورے سے واپس تشریف لائے۔ انہوں نے "انجمن مصنفین" کے قیام پر ہم نوجوان ادیبوں کو مبارک باد دی۔ اور پاکستان کے ادیبوں کی حالت بتاتے ہوئے ایک نیا انکشاف کیا کہ پاکستان کے ترقی پسند ڈاکٹر محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، وقار عظیم اور دوسرے سارے ادیب بھی آج کل ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کے بھی تقریباً وہی خیالات ہیں جو ہمارے ہیں۔ تو ہم بہت خوش ہوئے۔ ویسے بھی ہم سارے ادیب برِ عظیم ہند میں رہنے کے باوجود خود کو پاکستان ہی سے زیادہ قریب محسوس کرتے تھے۔

ہندوستان سے ہمیں نفرت ہو گئی تھی۔ ہم سے بیشتر ادیبوں نے "ہندوستانی یونین" کا نام "ہندو یونین" رکھ دیا تھا۔ اخبارات میں، رسائل میں اور ریڈیو سے ہم "ہندو یونین" کے خلاف بڑا زہر اگلا کرتے تھے۔

انجمن مصنفین کو ایک ریڈیو سیٹ بھی ملا تھا جس میں پاکستان کا میٹر ہم نے "ریڈیو گھر" سے خاص طور پر بنوالیا تھا ان دنوں "ریڈیو گھر" (ریڈیو مرمت کی ایک دکان) ریڈیو سیٹ میں پاکستان ریڈیو کا میٹر بنانے کا کام انجام دے کر کافی پیسہ کما رہا تھا ہم ریڈیو پاکستان کی خبریں بڑی پابندی سے سنا کرتے تھے۔ نہ صرف ہم بلکہ حیدر آباد کے مسلمان ہر رات نو بجے ہوٹلوں کے ریڈیو کے پاس، پبلک ریڈیو کے پاس، گھریلو ریڈیو کے پاس زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو کر

پاکستان کی خبریں سنا کرتے تھے۔ ٹھیک سوا نو بجے جب ریڈیو پاکستان سے یہ آواز بلند ہوتی:

"اب آپ شکیل احمد کی زبانی اردو میں خبریں سنئے:"

تو لوگ کہہ اٹھتے ـــ یہ شیر بول رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان کا اناؤنسر شکیل احمد تک حیدر آبادی مسلمانوں میں ایک خاص اہمیت اور وقعت کا حامل تھا۔

کبھی کبھی کوئی بھول کر آل انڈیا ریڈیو آن کرتا۔ اور یہ آواز سنتا:

"یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اب آپ آل حسن کی زبانی ہندوستانی میں سماچار سنئے۔"

تو سب آل حسن کو گالی دے کر لاحول پڑھتے ہوئے فوراً ریڈیو بند کر دیتے۔

خدا کے مہمان

حیدر آبادی مسلمانوں میں ہندوستانی یونین کے خلاف نفرت کا جذبہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ اور جوں جوں سی پی، یوپی، دہلی، بنگال، بہار اور مشرقی پنجاب سے لٹے ہارے، زخمی اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے قافلے حیدر آباد آنے لگے تو یہ جذبہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا ـــ روزانہ دو تین اسپیشل ٹرین انقطاع ہند کے مسلمان مہاجرین کو حیدر آباد پہنچانے لگیں نام پلی اسٹیشن پہ جیسے کوئی عرس یا میلہ سا لگا ہوتا تھا۔ کالجوں کے نوجوان لڑکے اور مسلمان رضاکاروں نے مہاجرین کی خدمت گذاری کے لئے خود کو پیش کیا۔ وہ ہر سپیشل ٹرین پر موجود رہتے۔ مہاجرین کی ہر ممکن مدد کرتے۔ ان کے دکھوں میں شریک

ہوتے۔ ان کو "سرکاری کیمپ" میں پہنچاتے۔

حکومت حیدرآباد نے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے باضابطہ ایک محکمہ قائم کر دیا جس کے لئے بڑے بڑے تنخواہ دار افسر مقرر کئے گئے۔ ان تقررات میں مجلس اتحاد المسلمین کے با اثر لیڈروں کے عزیز و اقارب کا خاص خیال رکھا گیا۔ اور بہت سے "بھانجے بھتیجے" بڑے بڑے عہدہ دار بن بیٹھے جو مہاجرین کی آبادکاری سے زیادہ اپنی اور اپنے خاندانوں کی آبادکاری کے کاموں میں بڑے مستعد تھے۔ بعض عیاش عہدہ داروں نے نوجوان مہاجر خواتین کی خلوتوں میں بھی بڑی "غمگساری" کی۔ بعض ضرورتمند عہدہ داروں نے مہاجرین سے بھی رشوتیں لیں۔ بعض موقع باز عہدہ داروں نے غبن اور غضب کے ہتھیار بھی استعمال کئے۔

"مہاجرین" میں بھی بعض بڑے دلچسپ لوگ حیدرآباد آ گئے۔ بعض عادتاً چوری چکاری بھی فرما لیا کرتے تھے۔ بعض نشے سے بھی غم غلط کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن میں خواجہ معین الدین کے گھر بیٹھا تھا کہ ناگپور کے ایک "مصیبت زدہ" مہاجر تشریف لائے اپنی دکھ بھری کہانی سنا کر بڑی دیر تک روتے رہے۔ میرے دوست معین الدین اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوراً دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ان کے حوالے کر دیا وہ آنسو پونچھتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

مگر اسی شام جب میں، معین اور نظر حیدرآبادی کنگ سرکل ریستوران کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے تو ایک رکشا ہمارے قریب رکی۔ جس میں وہی مصیبت زدہ مہاجر تشریف فرما تھے جنہیں صبح معین نے دس روپے کا نوٹ دیا تھا اس وقت وہ

"مہاجر" صاحب مصیبت زدہ نہیں تھے بلکہ بڑے ترنگ میں تھے۔ نشے میں دھت تھے اور رکشا روک کر ہم سے "محبوب کی مہندی" کا پتہ پوچھ رہے تھے۔ جہاں حیدرآباد کی رنڈیاں رہتی تھیں۔

معین کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے ان کی قمیص کا کالر پکڑ لیا۔ مگر میں نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا اور معین سے کہا:

"یار جب سب عیش کر رہے ہیں تو اسے بھی عیش کرنے دو بیچارا غم غلط کر رہا ہے۔"

اس کے بعد میں اپنی چچی کے گھر گیا تو وہاں ایک ہنگامہ دیکھا میں نے پوچھا کیا بات ہے — ہچچی نے بتایا کہ انہوں نے ایک مہاجر عورت کو بطور "ماما" نوکر رکھا تھا۔ مگر آج وہ چاندی کا پاندان اور ہیرے کے ٹاپس چرا کر چمپت ہو گئی۔

مجھے بڑی ہنسی آئی۔ میں نے انہیں تسلّی دی۔

"کوئی بات نہیں۔ مجبوری اور مفلسی میں انسان کا کردار باقی نہیں رہتا۔ اور آپ سارے مہاجرین کو کیوں اچھا سمجھ رہے ہیں ان دس پندرہ ہزار مہاجرین میں چور بھی ہوں گے، ڈاکو بھی ہوں گے، شرابی بھی ہوں گے فاحشہ بھی ہوں گے، گرہ کٹ بھی ہوں گے — برے بھی ہوں گے اچھے بھی ہوں گے۔ چلیئے پاندان اور ٹاپس پر فاتحہ پڑھ دیجئے۔"

ان مہاجرین میں بعض مہاجرین "مقامی" بھی تھے جو حیدرآباد سے حیدرآباد ہی کو ہجرت

کو آئے تھے۔ میں ایک دن "مولا علی پناہ گزین کیمپ" دیکھنے گیا تھا۔ وہاں مہاجرین کو کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جانا پہچانا آدمی بھی ہاتھ میں پلیٹ لئے کھڑا ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ وہ ہمارا ملازم "محمد قاسم" تھا۔ جو میرا ایک گرم سوٹ اور ۷۵ روپے چرا کر کچھ عرصہ پہلے بھاگ گیا تھا۔ میں نے اپنے دوست محی الدین احمد خاں افسر مولا علی کیمپ سے پوچھا۔

"یہ کہاں کا مہاجر ہے ——؟

اس نے بڑی سادہ لوحی سے جواب دیا

"گوالیار کا —— بیچارے کے خاندان کو ہندوؤں اور سکھوں نے قتل کر دیا۔"

میں مسکرا کر چپ ہو گیا۔ مگر محمد قاسم نے جونہی مجھے دیکھا اس کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی —— اور میں دانستہ، انجان بن کر وہاں سے ہٹ گیا۔

گھر آ کر میں نے اپنی بیوی اور بھائیوں سے جب گوالیار کے اس مہاجر کا قصہ سنایا۔ جس کے خاندان کے سارے افراد کو ظالم ہندوؤں، اور سکھوں نے قتل کر دیا تو ہم سب کے سب بڑی دیر تک ہنستے رہے۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ حیدر آباد کے بہت سے "بیروزگار انصار" بکمال صفائی "مصیبت زدہ مہاجرین" بن گئے ہیں۔

ان بیرونی اور مقامی مہاجرین کے لئے حیدر آباد کے "انصاریوں" کے گھر سے کھانا پک کر جایا کرتا تھا۔ رضا کار ہر گھر سے روٹیاں اور سالن جمع کرتے تھے۔ اور "پناہ گزین کیمپوں"

میں لے جاتے تھے۔ بعض بعض خدا ترس انصاری تو اپنے گھر سے مرغن غذائیں مثلاً مرغ، پلاؤ، زردہ، مچھلی وغیرہ بھی بھیجا کرتے تھے۔ تاکہ مہاجرین کا غم غلط ہو۔

مہاجرین کی حالت دیکھ کر سبھی پر رقت طاری ہوتی تھی۔ ضلع گلبرگہ کے اوّل تعلقدار صاحب بیچارے کچھ اتنے رقیق القلب تھے کہ ایک بار وہ باشندگان گلبرگہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے رو پڑے اور روتے روتے فرمایا:—

”یہ مہاجرین خدا کی طرف سے آئے ہیں۔ خدا نے انہیں ہمارے پاس مہمان بھیجا ہے۔ یاد رکھو ان کا پیشاب عطر ہے اور ان کا پاخانہ صندل —— انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔“

یہ تقریر سن کر حاضرین بھی رو پڑے۔

مہاجر کیمپ اچھی خاصی نو آبادیاں تھیں۔ جہاں خانہ بدوش انسان از سرِ نو زندگی شروع کر رہے تھے۔ ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے انتظامات کے علاوہ حکومت ان کے مستقل قیام کے لئے انہیں ”ملکی صداقت نامے“ بھی دیا کرتی تھی اور ملازمتوں اور تجارت کا بھی بندوبست کرتی تھی —— مگر جو بھی مہاجر آیا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی غریب نہیں تھا۔ ہر مہاجر اپنے وطن میں کسی بڑی ملازمت پر تھا تو کسی بڑی دوکان اور فرم کا مالک تھا۔ جو مہاجر اپنے وطن میں معمولی مدرس تھا حیدرآباد میں پروفیسر تھا۔ جو وہاں وکیل تھا یہاں بیرسٹر تھا۔ جو وہاں چھابڑی فروش تھا یہاں بڑا جنرل مرچنٹ تھا۔ جو وہاں کمپاؤنڈر تھا یہاں ڈاکٹر تھا۔ جو وہاں سپاہی تھا۔ یہاں سکنڈ لفٹننٹ تھا۔ جو وہاں بھنگی تھا۔ یہاں تو نوابی ٹھاٹ

کا دارو غہ تھا۔

طالب علموں میں کوئی بھی گریجویٹ سے کم نہیں تھا۔ اور ظاہر بات ہے کہ اس تباہی میں سب کی بی۔ اے کی ڈگریاں بھی جل کر راکھ ہوگئی تھیں۔

مہاجرین کیمپ میں روزانہ آپس میں لڑائیاں جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ کسی نہ کسی بات پر مہاجرین اور مہاجرات میں آنکھیں بھی لڑتی تھیں۔ دل بھی لڑتے تھے۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ انسان آخر دل و نظر رکھتا ہے۔ مہاجرین میں آپس میں شادیاں بھی ہونے لگیں لیکن ایسے ملاپ کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ بعض بعض اوقات دہلی کے مہاجرین اور ناگپور کے مہاجرین، پٹیالہ کے مہاجرین اور بہار کے مہاجرین آپس میں لڑ پڑتے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کا اثر مہاجرین کیمپوں پر بھی پڑا تھا۔

لیکن تعلیم یافتہ جمہوری مزاج مہاجرین نے ہر کیمپ میں ایک ایک "انجمن مہاجرین" قائم کر لی تھی جس کا کام صرف یہ تھا کہ انصاریوں اور حکومت کے عہدہ داروں سے مہاجرین کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کی جائے۔ بعض بعض اوقات انجمن مہاجرین حکومت اور انصاریوں کے خلاف کھلم کھلا جلسے بھی منعقد کرتی تھیں۔ ریزولیوشن پاس کرتی تھیں اور حکومت اور انصار کے سر شرم سے جھک جاتے تھے۔

حیدرآبادی باشندوں نے خدا کے ان مہمانوں کی ہر ممکن خاطرداری کی۔ بڑی ایثار و قربانیاں کیں۔ آدھے پیٹ خود کھایا انہیں کھلایا۔ اپنے گھروں سے قمیص، پاجامے، چادر، تکئے، کمبل، روپے، روٹیاں سب کچھ دیا۔ لیکن انسان میں اتنی کہاں مجال کہ خدا کے

مہمانوں کی میزبانی کر سکے۔

مہاجرین آزردہ ہی آئے تھے آزردہ ہی رہے۔

مسٹر اتحاد المسلمین

ان مہاجرین کے حیدرآباد کی طرف رخ کرنے سے حیدرآباد اور ہندوستان کے تعلقات اور کشیدہ تر ہو گئے۔ ہندوستانی حکومت اور حیدرآبادی ہندوؤں کا خیال تھا کہ حیدرآباد ان مہاجرین کو اپنے ہاں نہیں جگہ دے رہا ہے بلکہ اپنے قلب میں ہندوستان اور ہندوؤں کے خلاف نفرت جمع کر رہا ہے حیدرآبادی مسلمان بڑے خوش تھے کہ ہندوستانی مسلمان پاکستان کا رخ کرنے کے بجائے حیدرآباد آ رہے ہیں۔ یعنی ان کے خوابوں کے جنوبی پاکستان کی حقیقی تعبیر کی تعمیر کر رہے ہیں۔

مجاہد اعظم نے ان مہاجرین کے آنے کے بعد سے اپنی ہر تقریر میں ریاست کے مسلمانوں کی کل تعداد میں تصحیح کر لی تھی اب اپنی تقریروں میں وہ ۲۵ لاکھ کے بجائے ۳۵ لاکھ مسلمانوں کی نمایندگی کا دعویٰ کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی یونین کے رہنماؤں کو بار بار متنبہ کیا کہ حیدرآباد کے ۳۵ لاکھ مسلمان اپنے حیدرآبادی ہندو اور دیگر اقوام کے بھائیوں کے ساتھ صلح و آشتی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اگر ان کی طرف بری نظر سے دیکھا گیا تو سارے ہندوستان کا امن خطرے میں پڑ جائے گا۔
انہوں نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ہندوستان حیدرآباد کی آزادی اور خودمختاری چھیننا چاہے گا تو پھر اسے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ ہم لال قلعے پر اپنا جھنڈا لہرائیں گے۔
اور الٹی میٹم ہندوستان اور پاکستان کے سارے اخبارات میں شائع ہوا۔ بعض

سنجیدہ مسلمانوں کا بھی خیال تھا کہ مجاہدِ اعظم حد درجہ جذباتی ہیں

میں نے مجاہدِ اعظم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجاہد اعظم سید قاسم رضوی بے حد جذباتی واقع ہوئے تھے لیکن ایک بات میں نے ان میں خاص طور پر دیکھی ہے۔ وہ تھا ان کا خلوص ——— وہ ایک ایماندار، راست باز اور صاحب کردار ہستی تھے۔ ان کی فطرت میں دھوکہ اور فریب مطلق نہیں تھا ——— ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو میری یہ تعریف بری معلوم ہو۔ کیونکہ آج ہندوستان، پاکستان اور خود حیدرآباد کے بیشتر لوگ مجاہد اعظم کو برے ناموں سے یاد کرتے ہیں لیکن میں حقیقت کو جھٹلانا نہیں چاہتا ——— یہ صحیح ہے کہ ان کی سیاست کی بنیاد غلط تھی۔ جذباتی تھی اور تباہ کن ثابت ہوئی لیکن اس میں سید قاسم رضوی کی ذاتیات کو بہت کم دخل ہے۔ وہ ایک "اللہ والا" انسان تھا۔ ہمیشہ اللہ کی قوت پر بھروسہ رکھتا تھا۔ اس کو اپنوں نے جتنا بدنام کیا اور جتنا نقصان پہنچایا۔ اس کا تذکرہ بے حد تکلیف دہ ہے۔

نام نہاد عوامی وزراء اور مجلس اتحاد المسلمین کے ذمہ دار عہدہ داروں نے قاسم رضوی کا نام استعمال کر کے ریاست میں وہ لوٹ مار مچائی تھی کہ ساری ذمہ داری رضوی صاحب پر آئی تھی۔ ویسے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اور ان کی تحریک فاسسٹ نہیں تھی وہ یقیناً ایک فاشستی لیڈر تھے اور ایک قسطائی زوال پذیر بورژوا نظامِ حیات کے حامی تھے۔

مگر بذاتِ خود رضوی صاحب اتنے بھیانک نہیں تھے جتنا کہ ہندوستانی یونین کے پریس اور ریڈیو نے انہیں بنایا تھا۔ ان کا نظریہ سیاست غلط سہی لیکن وہ پوری ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اس نظریہ پر کاربند رہے ——— یہ صحیح ہے کہ ان کی رضاکارانہ تحریک میں خود غرضوں، موقع پرستوں، لالچیوں اور غنڈوں کو بڑے نمایاں مقام مل گئے تھے۔

کئی بار ان کے قریبی ملنے جلنے والوں اور دوستوں نے انہیں متوجہ کیا کہ آپ کا حاشیہ خراب ہے۔ آپ کی بدنامی بڑھ رہی ہے۔ ایسے لوگوں کو الگ کیجئے۔ مگر وہ مسکرا کر یہی کہتے:

"اللہ مالک ہے۔ وہ منصفِ حقیقی ہے"۔

اس نقطہ نظر کا اثر تھا کہ ان کی سیاست کمزور تھی۔ اور ان میں خود لیڈر شپ کے کنٹرول کا فقدان تھا۔

اس نرم مزاجی کا یہ نتیجہ ہوا کہ چراغ تلے اندھیرا بڑھتا گیا۔ چھوٹے چھوٹے جاہل آدمیوں کے ہاتھ میں اقتدار آگیا تھا اور وہ چوری کرتے وقت، عورتوں کا اغوا کرتے وقت زنا بالجبر کرتے وقت، انسانوں کو قتل کرتے وقت قاسم رضوی کا نام لیتے تھے ۔۔۔ اور قاسم رضوی حالات سے بالکل بے خبر بدنام ہوتے گئے ۔۔۔۔۔۔ اور بدنام ہوتے رہے۔

رضاکار تحریک میں بشیر احمد وکیل جیسے بدکردار شخص کو ریاست بھر کے رضاکاروں کا سالار اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ جو حیدرآباد کا جاہل ترین اور آوارہ ترین آدمی تھا۔ قاسم رضوی کی بدنامی اور زوال میں یامین زبیری، عبدالرؤف، عبدالرحیم، اکرام اللہ کے علاوہ بشیر احمد کا بھی زیادہ ہاتھ ہے۔

بشیر احمد سالار اعلیٰ کی زیر سرکردگی میں رضاکاروں نے چوری، ڈکیتی، زنا بالجبر اغوا، قتل، لوٹ، آتشزدگی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ قاسم رضوی نے جس مقصد کی خاطر اس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ وہ فوت ہو چکا تھا۔ اور تحریک اتنی خراب اور بدنام ہو گئی تھی۔ کہ قاسم رضوی صاحب سے بھی اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

اضلاع، گاؤں اور دیہاتوں میں ہندو رضاکاروں کے نام سے کانپ اٹھتے تھے۔ ان کے گھر، ان کی آبرو، ان کی زندگیاں کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔ ہر غنڈہ اور لفنگا رضاکار وردی پہن کر ہندوؤں کو اپنا غلام اور ان کی عورتوں کو اپنا بستر سمجھتا تھا۔

میں نے انظر حیدرآبادی نے، سید شاہ بلیغ الدین حسین نے کئی بار سید قاسم رضوی کی خدمت میں عرض کیا:

تحریک بدنام ہو رہی ہے۔ آپ بدنام ہو رہے ہیں بشیر احمد کو الگ کر دیجئے۔ اس کی، اور دوسرے غنڈہ رضاکاروں کی بدنامی آپ کے سر آ رہی ہے۔

مگر قاسم رضوی صاحب کو یقین نہ آتا تھا۔ وہ فرماتے تھے:

"مسلمان بدکردار نہیں ہوتا"

قاسم رضوی بدکردار نہیں ہو سکتا۔ مگر عام مسلمان بدکردار ہو سکتا ہے۔ اور رضاکار کا بھیس بدل کر وہ مسلمان بھی باقی نہیں رہا ہے ——

مگر رضوی صاحب کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ دارالسلام اور دارالسلام سے "شاہ منزل" (وزیر اعظم کا دفتر) کے چکر لگایا کرتے تھے۔ اس لئے کہ میر لائق علی مہینے میں کم از کم ایک بار ایک حیدرآبادی وفد دہلی لے جاتے تھے —— ہندوستان کسی قیمت پر بھی حیدرآباد کی ایک الگ جغرافیائی اور سیاسی وحدت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اور حیدرآباد کسی شرط پر بھی ہندوستان میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔

بالآخر گفت و شنید بالکل ناکام ہو گئی۔ حالات بہت خراب ہو گئے۔ حیدرآباد نے

تیزی سے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہر کارخانے میں اسٹین گن، برین گن، پستول، ہینڈ گرینیڈ اور بم تیار ہونے لگے ـــــ جنگ کا خطرہ دن بدن بڑھنے لگا حیدر آباد میں محکمہ اے۔ آر۔ پی۔ پھر سے قائم ہو گیا۔ سڑکوں پر جگہ جگہ ہوائی حملے سے بچاؤ کی پناہ گاہیں اور خندقیں کھودی جانے لگیں۔ اخبارات میں ہوائی حملے سے بچاؤ کی ترکیبیں اور فرسٹ ایڈ کے اصول شائع ہونے لگے ـــــ حیدر آباد ریڈیو نے اپنا پروپیگنڈا تیز تر کر دیا۔ حیدر آباد ریڈیو پہلے صرف ۴۱۱ میٹر پر چلا کرتا تھا مگر ایک انگریز مسٹر شین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جس نے شارٹ ویو کے ٹرانسمیٹر بھی نصب کئے۔ اور حیدر آباد ریڈیو شارٹ ویو پہ ۳۱ میٹر پر سنا جا سکتا تھا۔ اور اس کے علاوہ ۴۹ اور ۷۶ میٹر پر بھی حیدر آباد ریڈیو سے نیم سیاسی نیم فوجی پروگرام براڈکاسٹ ہوتے تھے

اس کے علاوہ انگلستان اور امریکہ سے تنخواہ دار جرنلسٹ بھی بلائے گئے جو ریاست حیدر آباد کے سرکاری مہمان خانے "گرین لینڈ" میں مقیم تھے۔ حکومت نے ان کے قیام و طعام کا نہایت شاندار اور اعلےٰ پیمانے پر انتظام کیا تھا۔ یہ اپنے اپنے اخباروں میں حیدر آباد کی آزادی اور خود مختاری کی حمایت میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس لئے کہ اس کام کے عوض انہیں کثیر معاوضہ ملتا تھا۔ اور ویسے بھی حیدر آباد کی آزادی آزاد ہندوستان میں ان کی اپنی آزادی بھی تھی۔ حیدر آباد کی آزادی کا مطلب امریکہ کی آزادی تھی۔ انگلستان کی آزادی تھی۔ اسی زمانے میں آزاد حیدر آباد کا ایک وفد اپنا مسئلہ نواب معین نواز جنگ کی قیادت میں لیکسکس یو۔ این۔ او میں لے گیا۔

سڈنی کاٹن دی اسٹین گن

حیدر آباد کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے یورپ اور امریکہ میں بڑے ہمدرد پیدا ہو گئے تھے —— در اصل سب کی نگاہیں حیدر آباد کی کثیر دولت پر جمی ہوئی تھیں —— چنانچہ سڈنی کاٹن بھی حیدر آباد کی آزادی اور خود مختاری پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ سڈنی کاٹن جو دنیا کا پائیلٹ نمبر ایک ہے۔ اس نے اپنے ہوائی جہاز حیدر آباد کی خدمت کے لئے پیش کئے۔ اور وعدہ کیا کہ وہ ہتھیار اور دیگر آلاتِ حرب اپنے جہازوں کے ذریعے حیدر آباد پہنچائے گا۔

سڈنی کاٹن ایک بے خطر اور اوڈ بچرنس پائیلٹ تھا وہ بغیر لائسنس کے ہندوستانی فضاؤں میں پرواز کرتا آتا اور حیدر آباد کو اسلحہ دے جاتا۔ ہندوستانی فضائیہ کے جہاز ہمیشہ اس کے تعاقب میں لگے رہتے مگر کبھی اس کا نشان تک نہ پا سکے۔

لوگ گھروں میں، ہوٹلوں میں، سڑکوں پر، دفتروں میں سرگوشیاں کرتے تھے کہ لاتعداد اسلحہ حیدر آباد آ چکا ہے اور آ رہا ہے۔ خود حیدر آباد کی فیکٹریوں میں روزانہ بیسوں سٹین گنیں اور برین گنیں بننے لگیں —— اور دارالسلام کے دارالحرب میں جمع ہونے لگیں مگر انسان کی نفع خوری دارالحرب میں بھی گھس گئی۔ بعض رضاکار رہنماؤں نے اسلحہ جات کی چور بازاری شروع کر دی۔ قاسم رضوی صاحب کی علم و اطلاع کے

بغیر اپنے ذاتی اثرات کو کام میں لاکر یہ لوگ دارالحرب سے اسلحہ جات اٹھالیجاتے اور دو دو سو تین سو روپے کی ایک گن یا ایک پستول کو ہزار ہزار ڈیڑھ ہزار روپے تک فروخت کرتے تھے۔

مجلس اتحاد المسلمین کے بعض چھوٹے لیڈر اسلحہ جات کی چوربازاری میں دیکھتے ہی دیکھتے اتنے مالدار ہو گئے کہ گھر بنانے لگے۔ گھر خریدنے لگے۔ جائیدادیں خریدنے لگے۔ میں نے خود ایک اسٹین گن اتحاد المسلمین کے ایک بہت ذمہ دار لیڈر (جن کا نام میں نہیں بتانا چاہتا) ساڑھے بارہ سو روپے میں خریدی۔ حالانکہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اگر میں قاسم رضوی صاحب سے اجازت حاصل کرتا تو وہی بندوق مجھے ڈھائی سو روپے میں مل جاتی۔ بات یہ ہوئی تھی کہ میرے والد صاحب ضلع عثمان آباد میں رہتے تھے وہاں ہمارے کھیت تھے۔ ان دنوں عثمان آباد ضلع کی حالت بڑی خراب ہو گئی تھی کیونکہ عثمان آباد حیدرآباد اور ہندوستان کی سرحد پر واقع ہے۔ والد صاحب نے ذاتی تحفظ کی خاطر ایک اسٹین گن خریدنی چاہی تھی۔ انہوں نے مجھے اس لئے کہا تھا کہ میرا اتحاد المسلمین میں کچھ اثر تھا اس لئے وہ سستے داموں مل جائے گی۔ مگر لیڈر محترم نے خود میرے ساتھ چار سو بیسی کی۔

اتحاد المسلمین کے بعض مخلص کارکنوں کا خیال ہے کہ پچھتر فیصدی رضاکاروں نے اسلحہ کی چوربازاری کی ہے اور خوب منافع کمایا اور خوب روپیہ بنایا ہے۔

ایک اور واقعہ میں جانتا ہوں کہ ایک رضاکار نے دارالسلام سے پانچ اسٹین گنیں ایک ہندو جاگیردار کو اونے پونے داموں بیچ دیں۔ اور وعدہ کیا جب بھی انہیں

اسلحہ کی ضرورت ہوگی۔ وہ منہ مانگے داموں پر دارالسلام کے دارالحرب سے انہیں پہنچاتا رہے گا۔

اور وہ اپنا وعدہ برابر پورا کرتا رہا۔

سچ پوچھیے تو مذہب صرف روپیہ تھا۔

مذہب صرف نفع خوری تھا

مذہب دراصل زندگی کی خالی جھولی میں روپے بھرنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ ورنہ مسلمان تو کوئی تھا ہی نہیں ــــــ نام کے مسلمان تو ۳۵ لاکھ بھی تھے۔ لڑنے مرنے، لوٹ کھسوٹ، چوری ڈاکہ کے لئے غنڈے بھی مسلمان اور رضاکار بن گئے تھے۔

ادھر حیدرآباد میں جنگی تیاریاں پورے زور شور سے جاری تھیں۔ ادھر ہندوستانی رہنماؤں نے حیدرآباد کے مسئلے کو اپنی ساری توجہات کا مرکز بنا دیا۔

سردار پٹیل کہتے:

حیدرآباد ہندوستان کے پیٹ میں ناسور بنا ہوا ہے

مجاہد اعظم جواب دیتے:

یہ ناسور ہندوستان کی موت کا باعث ہوگا۔

سردار پٹیل فرماتے:

حیدر آباد کی آزادی دیوانے کی آزادی ہے۔

مجاہد اعظم جواب دیتے:

یہ دیوانہ ہوشمندوں سے زیادہ دانا ہے۔

پنڈت نہرو دعوے کرتے:

عنقریب ہم حیدر آباد پر قبضہ کرلیں گے

مجاہد اعظم جواب دیتے:

ہم لال قلعے پر آصفیہ جھنڈا لہرائیں گے۔

ان سوالات اور جوابات پر حیدر آباد کے لوگ جلسوں میں، محفلوں میں، گھروں میں، ہوٹلوں میں بڑی زوردار اور بڑی بے نتیجہ بحثیں کرتے تھے۔

ایک کہتا:-

حیدر آباد کیسے آزاد رہ سکتا ہے۔ وہ چاروں طرف ہندوستانی یونین سے گھرا ہوا ہے۔

دوسرا جواب دیتا:

حیدر آباد خود کفیل ہے۔ اسے دوسروں کا کبھی محتاج نہیں ہونا پڑے گا۔ اپنے وطن میں کیا نہیں ہے پیارے۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے۔

ایک کہتا:

کاش حضور نظام انگریزوں کے دور میں کم از کم پچھلی ٹیم کی بندرگاہ ہی خرید لیتا۔ پھر وہ ہندوستانی یونین سے گھرا ہوا نہ ہوتا اور بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم رکھ سکتا۔

دوسرا جواب دیتا:

حیدرآباد رقبہ میں جزائر برطانیہ کے برابر ہے جب جزائر برطانیہ آزاد رہ سکتا ہے تو حیدرآباد کیوں نہیں۔ ہماری ضرورت کی ساری چیزیں ہمارے پاس ہیں۔ ریلیں ہماری ہے۔ ہوائی جہاز ہمارے ہیں۔ نہریں، دریا اور تالاب ہمارے ہیں کھیت ہمارے ہیں فیکٹریاں ہماری ہیں۔ لوہا۔ کوئلہ اور سونا کی کانیں ہمارے پاس ہیں ـــــ ہم نہ پہلے کبھی ہندوستان کے محتاج تھے اور نہ اب ہیں۔ اور نہ آئندہ کبھی رہیں گے۔

معاشی ناکہ بندی

انہی دنوں اخباروں میں خبر شائع ہوئی کہ ہندوستان نے حیدرآباد کی معاشی ناکہ بندی کر دی ہے۔ اب وہ ایک سوئی اور آل پن تک حیدرآباد کو نہیں بھیجے گا۔ ہندوستان کے اخباروں میں ایک کارٹون شائع ہوا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایک جھیل کے بیچوں بیچ برف کا

ایک تو وہ ہے۔ جس پر حضور نظام اور قاسم رضوی بیٹھے ہیں۔ ادھر افق سے معاشی ناکہ بندی کا سورج طلوع ہوا ہے۔ جس کی حدت سے برف کا تودہ پگھل رہا ہے ـــــ اس کے نیچے یہ عبارت لکھی تھی :۔

"جب معاشی ناکہ بندی کا یہ سورج بیچ سر پر پہنچے گا تب برف کا یہ تودہ بالکل پگھل جائے گا اور ہز اگزالٹیڈ ہائی نس مع قاسم رضوی پورے شاہانہ اعزاز کے ساتھ غرقِ آب ہو جائیں گے"۔

پہلے پہلے تو حیدر آباد یوں نے معاشی ناکہ بندی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ بلکہ ہر جگہ معاشی ناکہ بندی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں معاشی ناکہ بندی زیادہ سخت ہوتی گئی۔

میں ایک بار اپنے ایک دوست خواجہ حسین کے ساتھ سکندر آباد جامع مسجد کے سامنے والے ہیر کٹنگ سیلون میں شیو بنانے گیا تو موتی لال حجام نے جو خواجہ حسین کا واقف تھا۔ بولا : "صاحب۔ شیو کے لئے کوئی استرا نہیں ہے"۔

خواجہ حسین نے کہا :

"تم ابھی دو روز پہلے بمبئی سے آئے ہو۔ وہاں سے کیوں نہیں لائے؟"

موتی لال نے جواب دیا :

"صاحب۔ میں ایک ولائتی استرا خرید کر لا رہا تھا۔ مگر بوری بندر اسٹیشن پر میرے سامان کی تلاشی لی گئی اور میرا نام اور

پتہ لکھ کر وہ استرا اس شرط پر ضبط کر دیا گیا کہ حیدر آباد جب ہندوستان میں شامل ہو جائے گا تب یہ استرا انہیں دے دیا جائے گا۔

ہم لوگ ہنس پڑے اور ہندوستانی یونین کا مذاق اڑانے لگے کہ چلو جی ہندوستان حیدر آباد پر قبضہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی شیو کرنا چاہتا ہے۔ میں تصور میں ہندوستانی یونین کو مخاطب کر کے، بڑے تمسخر آمیز انداز میں یہ شعر گنگناتا ہوا سیلون سے باہر نکلا۔

کیوں مجھ کو ستاتی ہے تو اے گردشِ گردوں
میں نائی کا بیٹا ہوں کہیں سر نہ رگڑ دوں

اس کے بعد ہم رانی گنج کے بس سٹاپ پر آ کھڑے ہوئے۔ بس کے انتظار میں سگریٹ پینا میرا محبوب شغل ہے۔ میں نے سامنے کی دوکان سے کیپسٹن کا ایک پیکٹ خریدنا چاہا تو دوکاندار نے جواب دیا۔

کیپسٹن نہیں ہے صاحب

گولڈ فلیک ؟

نہیں

پلیرز ؟

نہیں

کریون ؟

نہیں

ولس ؟

نہیں

قینچی ؟

نہیں

پاسنگ شو ؟

نہیں۔

کہاں غائب ہو گئے سارے سگریٹ ؟

معاشی ناکہ بندی ہو گئی ہے صاب

میرے قریب ہی ایک کٹر "حیدر آبادی" کھڑے تھے۔ انہوں نے طنزیہ انداز میں مجھے رائے دی۔

آپ ملکی سگریٹ کیوں نہیں پیتے۔ کیا اب بھی آپ غیر ملکی صنعتوں کی سرپرستی فرمانا چاہتے ہیں آپ تو بڑے رضاکار لیڈر اور مشہور ادیب ہیں میں آپ کو جانتا ہوں۔

میں نے ان پر رعب ڈالنے کے لئے دکاندار سے کہا :

"اچھا بھئی ایک پیکٹ چار مینار سگریٹ ہی دے دو"۔

اس نے کہا :

"چار آنے دیجئے"۔

میں نے جواب دیا۔

کیوں۔ وہ تو تین پیسے کا پیکٹ ملتا ہے! اور وہ تو یہیں بنتا ہے۔

اس نے جواب دیا:

جی —— مہنگا ہو گیا ہے۔

میں نے پہلی بار چار آنے دے کر "چار مینار" کا ایک پیکٹ خرید لیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ چار مینار کی طلب یکدم بڑھ جانے سے قیمتیں بھی بڑھا دی گئیں ہیں۔ اور یہ بھی معلوم تھا۔ کہ کیپسٹن، گولڈ فلیک، پلیرز، کریون، ولز، قلینچی اور پاسنگ شو کا اب بھی کافی اسٹاک حیدر آباد میں موجود ہے —— لیکن معاشی ناکہ بندی ہمیشہ تھوڑی ہی آتی ہے۔ حیدر آباد کے سرمایہ دار تاجر اور سوداگر سب ہندوستان اور معاشی ناکہ بندی کو دعائیں دے رہے تھے کہ اس نے حیدر آباد میں چور بازاری کے مارے کھول دیئے ہیں۔ حیدر آبادی سرمایہ دار حیدر آبادی عوام کو دل کھول کر لوٹنے لگے۔

حکومت کی جانب سے جگہ جگہ پوسٹر لگائے گئے تھے کہ معاشی ناکہ بندی کا مقابلہ کرنے کے لیئے ہماری قومی غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم ناجائز منافع خوری اور چور بازاری سے پرہیز کریں۔ یہ ایک قومی خدمت ہے —— ہر دوکان پر اشیاء کی سرکاری کنٹرول نرخ کی فہرستیں آویزاں تھیں۔ مگر دوکانوں میں ان اشیا کا پتہ ہی نہیں تھا۔ دوکانیں خالی ہوتی جا رہی تھیں اور چور گودام بھرتے جا رہے تھے۔

خواجہ معین الدین اور عبد الرزاق لاری نے داڑھیاں بڑھا رکھی تھیں۔ کیونکہ ریزر بلیڈ غائب تھے۔ ویسے بھی داڑھی رکھنا عین اسلامی حرکت ہے۔ اپنی داڑھیوں پہ ہاتھ پھیر کر وہ گویا ہمیں مرعوب کرنا چاہتے تھے کہ قوم کا درد رکھنے والے ایسے ہوتے

ہیں کہ قوم کے چہرے کو خوبصورت رکھنے کے لئے اپنی صورت تک بگاڑ لیتے ہیں۔

میرے دوست نواب سید علی خاں اور فصیح الدین احمد نے اپنی اپنی کاریں گراج میں بند کر دی تھیں کیونکہ پٹرول نہیں ملتا تھا۔ اور پٹرول کا ایک ایک قطرہ حیدرآبادیوں کے لئے خون کے ایک ایک قطرے کے برابر تھا —— آخر ہمیں ایک ماڈرن جنگ لڑنی تھی۔ اور پٹرول ماڈرن جنگ کا لہو ہوتا ہے —— بڑے بڑے عہدہ دار تک سائیکلوں پر دفتر جانے لگے تھے۔

عید آئی —— لوگوں نے کپڑے تک نہیں بنائے۔ کیونکہ کپڑا تھا ہی نہیں۔ لیکن لوگ پرانے کپڑوں ہی میں عید منا کر یوں فخر بہ گلے مل رہے تھے جیسے قوم کی عزت کے لئے ایثار و قربانی ہی سب سے بڑی عید ہے۔

چل چلاؤ کا میلہ

پھر ایک دن شہر میں بڑی وحشت ناک خبر پھیلی کہ حکومت ہند نے بمبئی، بجواڑہ، منماڈ، اور بنگلور کے اسٹیشنوں پر حیدرآباد آنے والی ساری دوائیاں روک دی ہیں حتّیٰ کہ پوٹاشیم پرمینگنیٹ اور پھٹکری تک روک لی ہے جس سے شہر کے پینے کا پانی صاف ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں زوروں کا ہیضہ پھوٹ پڑا۔ عثمانیہ ہسپتال اور دوسرے سارے چھوٹے ہسپتالوں میں دوائی کی شیشیاں اور انجکشن کے ٹیوب خالی پڑے تھے۔ شہر میں پرائیویٹ ڈاکٹروں میں زیادہ تعداد ہندو ڈاکٹروں کی تھی۔ جو رضاکارانہ مظالم سے تنگ آ کر اپنی اپنی ڈسپنسریوں پر تالے لگا کر شولاپور، بجواڑہ، پونا، بمبئی اور مدراس چلے گئے تھے مسلمان

ڈاکٹر برائے نام تھے۔ البتہ ڈاکٹر لیسین زبیری نے مسلسل رات دن بغیر کسی معاوضے کے عوام کو کالرا کے ٹیکے لگاتے تھے۔ دوائیاں تقسیم کرتے تھے ڈاکٹر محمد عبدالحی اور ڈاکٹر لیسین زبیری نے سچ مچ اس وقت مصیبت زدہ انسانیت کی قابل تحسین اور ناقابل فراموش خدمت کی لیکن ڈاکٹر بغیر دوائیوں کے اپاہج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر چند تھے اور مریض سینکڑوں —— حیدرآباد کے مسلمان روزانہ تیس تیس چالیس چالیس مرنے لگے —— عید کے دن تو مرنے والوں کی تعداد ۵۰ افراد تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ بھی ایک شہادت ہے یہ سب شہید ہیں۔

مگر واہ ری شہادت اور واہ رے شہید ——!!

مرنے والوں میں اکثر کو کفن تک میسر نہیں ہوتا تھا کیونکہ کپڑے کی بھی معاشی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ لوگ بچوں کی لاشوں کو تولئے یا رومالوں میں لپیٹ کر اور بڑوں کی لاشوں کو چادروں، تہمدوں اور قمیضوں میں تکفین کر کے دفن کرتے تھے۔

شہر اور عثمانیہ یونیورسٹی کے درمیان امراض متعدی کا ہسپتال تھا۔ جو پہلے ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ لیکن اب اتنا آباد ہو گیا کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ہیضے کا شہر ہے۔ "کالرا سٹی" ہے۔ جہاں چل چلاؤ کا میلہ لگا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے سامنے اچھا خاصہ ہنستا مسکراتا انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا سے چلا جاتا —— میرے ایک بھوپالی دوست "مرکیش تخمی" کو جو صبح اچھا خاصہ تندرست تھا۔ شام کو ہیضہ ہو گیا لیکن بروقت طبی مدد پہنچ جانے پر وہ خطرے سے اور موت سے دور ہو گیا لیکن بڑے عرصے تک اسے کالرا سٹی کا معزز شہری بنا رہنا پڑا۔

لوگ بے تحاشہ مر رہے تھے۔ مگر اس وقت بھی بعض محبان حیدرآباد چوری چھپے وائرلس

اور کالرا انجکشنوں کی چور بازاری میں مصروف تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ہم نے میکش کمی کے لئے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر صاحب سے کالرا انجکشن کا ایک ٹیوب پچیس روپے میں خریدا تھا۔

یہ چل چلاؤ کا میلہ "بھی گویا غریبوں نے لگایا تھا۔ اس میلے میں اونچے طبقے اور متوسط طبقے کا ایک آدمی بھی ہمیں نظر نہیں آیا۔ سب غریب مفلس اور تہیدست مسلمان تھے جو مرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے اور مرتے چلے جا رہے تھے۔

بڑے اور مالدار مسلمانوں، نوابوں، جاگیرداروں اور عہدہ داروں کے لئے ٹیکہ اندازی کا معقول انتظام تھا۔ وہ گھروں میں پانی گرم کرکے پیتے تھے۔ مچھر دانیوں میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ہر کھانے پر ایک ایک بوتل سرکہ پی جاتے تھے سیروں پیاز کھا لیتے تھے۔ اور رات کو خوب شراب پیتے تھے کیونکہ شراب ہیضے کا بہت بڑا تریاق ہے بڑی مجرب دوا ہے لیکن جن کے گھر پانی گرم کرنے کے لئے ایندھن نہیں تھا۔ پیاز خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ سرکے اور شراب کی بوتلیں نہیں تھیں ان کے سامنے "آزاد حیدرآباد" موت کا دیباچہ بنا ہوا تھا جب کوئی غریب مسلمان مرجاتا تو مالدار مسلمان جھوٹے غم میں ڈوب کر ازراہ افسوس فرماتے:

چلو ـــــ وہ بے چارا انڈین یونین میں شامل ہو گیا۔

شری شعیب اللہ خاں سورگباشی

معاشی ناکہ بندی کے دور میں اسٹیٹ کانگریس (جو بالعموم حیدرآبادی ہندوؤں کی جماعت سمجھی جاتی تھی) اس کے ارکان اور اس کے اخبارات نے کچھ سرگرمی کا اظہار کیا

ورنہ اس سے پہلے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حیدر آباد میں ہندو رہتے ہی نہیں۔ یا اگر ہیں تو وہ راجہ بہادر رنگل وینکٹ راما ریڈی نائب وزیر اعظم، مسٹر جوشی وزیر، مسٹر بی۔ ایس۔ وینکٹ راؤ وزیر اور مسٹر شیام سندر لیڈر ریسپٹ اقوام ہیں۔ باقی ہندو سلطان بازار اور گولی گوڑہ کے محلوں میں محصور ہیں یا چھپے ہیں۔ ہندو سلطان بازار سے باہر کبھی نہیں نکلتے تھے۔ عابد روڈ، پتھر گٹی، معظم جاہی مارکٹ، افضل گنج وغیرہ پر کوئی ہندو نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی ساری لیڈر شپ یا تو بمبئی، پونا اور مدراس میں تھی یا جیل میں تھی۔ یا زیر زمین تھی —— اسٹیٹ کانگریس کے ایک مشہور لیڈر اور جرنلسٹ مسٹر نرسنگ راؤ کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا اور ان کے مشہور اخبار "رعیت" کو بند کر دیا گیا تھا۔ اسٹیٹ کانگریس کا صرف ایک اخبار ذرا پابندی سے شائع ہوتا تھا "امروز" جس کے ایڈیٹر قوم پرست مسلمان مسٹر شعیب اللہ خاں تھے جو اخبار "امروز" کے ہندو مالک کے نوکر تھے۔ اور وفاداری بشرط استواری کو اصل ایمان سمجھتے تھے۔ ان دنوں چونکہ اسٹیٹ کانگریس کے سارے ذمہ دار لیڈر پس منظر میں چلے گئے تھے۔ اس لئے مسٹر شعیب اللہ خاں "اندھوں میں کانا راجہ" بنے بیٹھے تھے۔ وہ ایک معمولی پڑھے لکھے، موقع باز اور ضمیر فروش اخبار نویس تھے۔ جنہیں نہ مسلمانوں سے ہمدردی تھی۔ اور نہ ہی ہندوؤں سے کوئی عقیدت یا محبت —— ان کی زندگی کا مطمع نظر بس روپیہ تھا۔

انہوں نے کئی بار مجھ سے اور نظر حیدر آبادی سے حیدر آباد کی سیاست پر گفتگو کی تھی۔ لڑائیاں کی تھیں۔ ان کی بحث سے ہمیشہ ہم نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اپنے آپ سے بھی SINCERE سنسیئر نہیں ہیں۔

ایک بار نظامیہ ہوٹل میں انہوں نے فرمایا تھا:

"میں دراصل ہندوؤں کو جھانسہ دے رہا ہوں۔ ان کو ایکسپلائیٹ (EXPLOIT) کر رہا ہوں۔ میں دراصل اتحاد المسلمین کے لیڈروں سے زیادہ مسلمان ہوں تم دیکھ لینا جب ہندوستان حیدرآباد پر قبضہ کرلے گا۔ اس وقت میں یہاں کے مسلمانوں کو بچاؤں گا۔

تم اور نظر حیدرآبادی بھی میرے ہی گھر پناہ لینے آ جاؤ گے میرا گھر اس وقت "ابوسفیان کا گھر" ہوگا۔

لیکن اچانک ایک صبح مجھے میرے بھائی نے جگایا اور تازہ اخبار سامنے کر دیا جس میں موٹے حروف میں لکھا تھا:

"شعیب اللہ خاں کا قتل"

ایک دو اخباروں نے "خس کم جہاں پاک" کی سرخی قائم کی تھی خبر کی تفصیل تھی کہ کل رات دو رضاکاروں نے مسٹر شعیب اللہ خاں کو اس وقت قتل کیا جب کہ وہ اپنے دفتر سے گھر واپس ہو رہے تھے۔

ہمیں اس قتل کا بڑا افسوس ہوا۔ شعیب سے ہمارے لاکھ سیاسی اختلافات سہی لیکن یہ قتل یقیناً ایک دیوانگی اور بہیمیت کا نتیجہ تھا۔ میں، خضر شہزاد اور عبدالرزاق لاری شعیب کے گھر گئے۔ وہاں کوئی مسلمان نہ تھا۔ سب کانگریسی اور ہندو تھے۔ حتےٰ کہ اس کے جنازے میں بھی کوئی مسلمان شریک نہیں ہوا۔ جب اس کا جنازہ محلے کی مسجدوں میں نماز جنازہ پڑھنے

کے لئے لے جایا گیا تو مسجدوں کے ملاؤں نے اس کے جنازے پر مسجدوں کے دروازے بند کر دیئے۔ اور نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا ــــــ سرِ شام بڑی کس مپرسی کے عالم میں اس کی لاش دفن کر دی گئی۔

وہ حیدر آباد میں تو بڑی بے عزت موت مرا لیکن ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں اس کی موت کو بڑی عزت دی گئی۔ آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ بی بی سی لندن نے اس کی موت پر اظہارِ افسوس کیا۔ لندن پارلیمنٹ میں اس کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ اور اس کے قتل کی ذمہ داری مجاہدِ اعظم قاسم رضوی پر ڈال دی گئی (اور اب مجاہدِ اعظم پر اسی قتل کا مقدمہ چل رہا ہے)۔ مگر جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے قاسم رضوی کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ قاسم رضوی کے ایک منہ چڑھے رضاکار لیڈر قادر محی الدین اسیر (جو آج کل قاسم رضوی کے خلاف سرکاری گواہ ہے اور جو پہلے قاسم رضوی کی ناک کا بال تھا اور قاسم رضوی نے اسے بڑی سرکاری ملازمت اور لاکھوں کے پرمٹ دلائے تھے) اس کی اور شعیب اللہ خاں کی یونیورسٹی کے زمانے سے دشمنی تھی یونیورسٹی یونین کے سالانہ انتخاب میں شعیب اللہ خاں سکرٹری شپ کے پوسٹ کے لئے اسیر کا مخالف امیدوار بھی تھا۔ اور اسیر نے انتخابات کے دن شعیب اللہ خاں کا اغوا کرادیا تھا۔ اور انتخاب جیت گیا۔ یونیورسٹی کے باہر عملی زندگی میں بھی اسیر کی شعیب سے سخت دشمنی رہی۔ وہ دونوں ہم محلہ بھی تھے ــــــ یعنی محلہ کاچی گوڑہ میں رہتے تھے۔ قادر محی الدین اسیر اس محلے کے رضاکاروں کا افسرِ اعلیٰ بھی تھا۔ باہمی دشمنی جب بہت عروج پر پہنچ گئی تو ایک رات اسیر نے شعیب کو دو رضاکاروں کی مدد سے قتل کرادیا۔

شعیب کے قتل کے دن شام کو میں، نظر حیدر آبادی شاہد صدیقی، جمیل احمد فاروقی اور خواجہ معین الدین قاسم رضوی صاحب کے گھر بیٹھے تھے۔ رضوی صاحب کسی گاؤں کے دورے سے واپس آئے تھے اس وقت قادر محی الدین اسیر بھی رضوی صاحب کے گھر آیا۔ مجھے یاد ہے رضوی صاحب نے اس وقت اسیر سے کہا تھا:

یہ بہت بری حرکت کی گئی ہے۔

سبھوں کو اس قتل کا افسوس تھا۔ رہی قاسم رضوی کی اس جرم میں اعانت، تو وہ یوں غلط تھی کہ قاسم رضوی ان دنوں "حیدر آباد" تھا۔ وہ چاہتا تو مسٹر نرسنگ راؤ کی طرح شعیب کو بھی قید کرا سکتا تھا۔ اس کا اخبار بند کرا سکتا تھا۔ مسٹر نرسنگ راؤ کے مقابلے میں شعیب کی حیثیت بالکل ہی معمولی تھی۔

بہر حال شعیب اللہ خاں قتل ہو گیا۔ مسلمان کہتے تھے جہنم واصل ہو گیا اور ہندو کہتے تھے کہ "سورگباش" ہو گیا۔

دو نئے مذہب

شعیب کے قتل کے بعد حیدر آباد اور اضلاع حیدر آباد کی فرقہ دارانہ فضا بڑی مکدر ہو گئی۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں اور گاؤں میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ اضلاع میں لوٹ مار اور قتل غارت گری کے بازار گرم ہو گئے۔ ہندو اضلاع سے ہندوستانی علاقوں میں بھاگنے لگے۔ اور ہندوستانی علاقوں میں حیدر آبادی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ بمبئی سے میرے بعض عزیزوں کے خطوط کہ آئے کہ وہاں کے مسلمانوں کو

حیدرآبادی جاسوس سمجھ کر گرفتار کیا جا رہا ہے۔ ہمارے افسانہ نگار دوست ع۔ احمد کے بھائی حنیف خمار جو کئی فلموں کی کہانیاں، مکالمے اور گیت لکھ چکے ہیں گرفتار کر لیا ــــــ سلطان حسین تاجر کتب جو ابتدا ہی سے بمبئی میں رہتے ہیں انہیں بھی حیدرآبادی جاسوس قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ بمبئی سے جو بھی مسلمان کسی حیدرآبادی کو خط لکھتا یا چار مینار سگریٹ خریدتا ــــ سی۔ آئی۔ ڈی پولیس اس کے پیچھے لگ جاتی تھی۔

مسلمان صرف ریاست حیدرآباد کے حدود کے اندر ہی سفر کرتے تھے جو قسمت کے مارے مسلمان کاروبار یا خانگی ضرورتوں سے بیرون حیدرآباد کا سفر کرتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ یہ وہ مسافر ہیں جو کبھی نہ واپس آئیں گے۔ گلبرگہ اسٹیشن جو ریاست کا سرحدی اسٹیشن ہے۔ اس کے آگے ہندوستانی یونین کا ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جس کا نام "دودھنی" تھا ــــ اور رضاکارانہ دور میں جس کا نام "حیدرآبادی مسلمانوں کی قتل گاہ" رکھا گیا تھا۔ اس اسٹیشن پر آریہ سماجی اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے غنڈے تھرڈ کلاس میں سفر کرنے والے غریب مسلمان مسافروں کو اتار اتار کر قتل کرتے تھے لیکن انہی گاڑیوں میں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں بڑے بڑے مالدار اور ذی اثر مسلمان بڑے اطمینان سے سفر کرتے تھے۔ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ نواب زین یار جنگ بہادر اور ان کی طرح کے کئی "جنگ بہادر" ہمیشہ حیدرآباد سے بمبئی آیا جایا کرتے تھے مگر وہ ان مسافروں میں شامل نہیں تھے۔ وہ نہ صرف ریل کا واپسی ٹکٹ بلکہ "زندگی کی واپسی" کا بھی ٹکٹ ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوستان (بلکہ پاکستان سے بھی) سارے مذاہب رخصت

ہو چکے ہیں اور صرف دو مذاہب باقی رہ گئے ہیں۔

ایک مذہب ——— امیری

دوسرا مذہب ——— غریبی

اور تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے حالات پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ مستقبل میں انسان انسان میں آویزش انہی دو مذاہب کے بارے میں رہے گی ——— اور ان دونوں مذاہب کی آویزش کے نتیجے کے طور پر دنیا میں انسانوں کا ایک غیر طبقاتی سماج قائم ہوگا جس کا مذہب انسانیت اور صرف انسانیت ہوگا۔

خبریں آنے لگیں کہ ہندوستانی افواج حیدرآباد کی سرحدوں پہ جمع ہو رہی ہیں۔ حیدرآبادی فوج اور رضاکاروں میں تیزی سے بھرتی شروع ہو گئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کو ایک غیر معین مدت کے لئے چھٹی دی گئی اور نوجوان طالب علموں کو سرکاری فوج میں اور قومی فوج میں شامل کرنا شروع کر دیا گیا ——— سڈنی کاٹن دن میں دو دو بار حیدرآباد کے چکر لگانے لگا۔ اور قاسم رضوی صاحب فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے عوام کو مخاطب فرماتے:

"گھبراؤ نہیں ——— ہتھیار آسمان سے برس رہے ہیں
خدا ہماری مدد پہ ہے اور پاکستان......

میر لائق علی ایک رات خفیہ طریقے پر سڈنی کاٹن کے پلین میں کراچی بھی گئے مع زیارت

بھی گئے۔ مسٹر جناح کی زیارت بھی کی۔ قائد اعظم سخت بیمار تھے۔ جاں بلب تھے۔ اسی لئے وہ ایک لفظ — NO — ساتھ لئے منہ لٹکائے حیدر آباد لوٹ آئے۔

حیدر آبادی اضلاع کی حالت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ عثمان آباد سے میرے والد محترم، والدہ اور چھوٹے چھوٹے بھائیوں نے ہمیں لکھا کہ بس ہم سب کا آخری وقت آ گیا ہے — شہر حیدر آباد کی حالت بھی بڑی ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جو جوالا مکھی عرصے سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا اب بہت جلد پھٹنے والا ہے اس کے اکے ڈکے دھماکے زمرد محل ٹاکیز اور پیلس ٹاکیز کے علاوہ عابد روڈ کے صدر پولس تھانے میں ہو چکے تھے۔

اضلاع سے امیر دولت مند مسلمان اور اتحاد المسلمین کے ضلع واری لیڈر عوام کو بے یار و مددگار چھوڑ کر شہر حیدر آباد بھاگے چلے آ رہے تھے — حیدر آباد شہر میں بھی سراسیمگی سی پھیل گئی تھی لیکن حیدر آباد کے ڈاکٹر گو شیلز حمید الدین احمد سکریٹری محکمہ نشر و اشاعت نے حیدر آباد ریڈیو کے اسٹاف کو حکم دیا کہ عوام کے مورل "MORAL" کو بلند رکھنے کے ریڈیو بغیر وقفے کے صبح سات بجے سے رات کے بارہ بجے تک چلتا رہے اور اس کے لئے حیدر آباد کے سارے اہل قلم کی خدمات حاصل کی جائیں —ڈاکٹر یونس حسین خاں، پروفیسر عزیز احمد، پروفیسر منظور حسین شور، اکبر وفاقانی، تحسین سروری صمد رضوی ساز، نظر حیدر آبادی، شاہد صدیقی، بدر شکیب، پروفیسر عبد القیوم خاں باقی، پروفیسر آغا حیدر حسین، شفاق جبلی، ریاض فرشوری۔ احمد عبد القیوم، محمود عبد الماجد، سلطانہ عزیز رفعت۔ امجد یوسف زئی، عزیز النساء حبیبی، سعیدہ مظہر، عرش حیدری، علی احمد جلیلی،

خیرات ندیم، تاج شہر بانو، ابن علی، شکور بیگ اور بہت سے ادیبوں نے رزمیہ فیچر، مضامین، افسانے، ڈرامے، نظمیں، کورس اور ترانے لکھنے شروع کر دیئے۔ جب کوئی پروگرام نہیں ہوتا تھا تو علامہ اقبال کا کلام سعیدہ ظہیر یا عزیز جاوید ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔

ریڈیو اسٹیشن اور دارالسلام دن دن بھر اور رات رات بھر جاگتے رہتے تھے۔ جب دیکھو آدھی رات میں یا کڑی دوپہر میں دارالسلام اور ریڈیو اسٹیشن دونوں مقامات پر ہجوم ہی ہجوم ہے۔ کام ہی کام ہے۔ شور ہی شور ہے ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے۔

جاگیردار اور سرمایہ دار کی سرگوشی

حضور نظام نے جب دیکھا کہ ریاست کی حالت بہت ابتر ہو گئی ہے۔ قاسم رضوی ڈکٹیٹر ہو گیا ہے اور حضور نظام خود بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے ڈر ہو گیا کہ اب قاسم رضوی اسے قتل کرا دے گا اور اس کی بے شمار و بے اندازہ دولت اس کے قبضے سے نکل جائے گی تو اس نے ایک رات خفیہ طریقے پر ہندوستان کے ایجنٹ جنرل متعینہ حیدر آباد مسٹر کے۔ ایم منشی کو اپنے محل میں بلوایا۔ اور اس کے سامنے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ کچھ کرو مجھے اور میری دولت کو بچاؤ۔ میں "امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین" بننے سے باز آیا۔ تم اگر وعدہ کرو کہ میری دولت بچا لو گے تو میں اب اپنا مذہب بدلنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں دراصل محض اپنے اقتدار اور اپنی دولت کے تحفظ کے لیے ہی کسی نہ کسی مذہب کا پابند رہنا ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ راز کی باتیں دوسرے دن حضور نظام کی پیشی کے ایک "مقرّب خاص" نے فاش کر دیں۔

مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ "نظام" اپنی موروثی اور خاندانی روایات کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ یہ نام نہاد امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین جس کا نام ریاست حیدر آباد کی ہر مسجد کے خطبے میں پڑھا جاتا تھا۔ آصفیہ تاریخ کے ابتدائی ادوار ہی سے مسلمانوں کو دھوکہ دیتا آیا تھا۔

ٹیپو سلطان کے انگریزوں کے خلاف جہاد آزادی میں اس نے سامراجی کافروں کی مدد کی تھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی تحریک آزادی جو انگریزوں کے خلاف شروع ہوئی تھی اور جو "وہابی تحریک" کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ نظام دکن نے انگریزوں کے حکم پر اپنے ریاست کے وہابی لیڈروں کو گرفتار کر لیا تھا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اسلامی ممالک مصر، ترکی اور فلسطین کے مسلمانوں کے خلاف نظام کی دولت اور اس کی آصفیہ فوج انگریزوں کی حمایت میں لڑتی رہی۔

۱۹۲۲ء میں ہندوستانی عوام کی آزادی کی تحریکیں خلافت اور عدم تعاون جس میں ہندو اور مسلمان ایک جان ہو کر انگریزی شہنشاہیت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ انگریزوں کے اس نمک خوار غلام نے اپنی ریاست میں "بہ فرمان خسروی" سارے سیاسی جلسوں کو ممنوع قرار دے دیا اور خلافت تحریک کے مسلمان لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونستا رہا۔

اور اب ایک بار پھر اس کی مکروہ فطرت حیدر آباد کے جاہل مسلمانوں کو جو اسے

امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، مسلمانوں کے اقتدار اعلٰے کا مظہر سمجھتے تھے اور جس نے خود فصاحت جنگ جلیل کی اصلاح دی ہوئی اپنی ایک غزل کے مقطع میں دعوے کیا تھا

سلاطین سلف سب ہو چکے نذر اجل عثماں
مسلماں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

دھوکہ دینے اور تباہ کرنے پر آمادہ تھی۔

قاسم رضوی کو جب اس سازش کی اطلاع ملی تو اس نے "کنگ کوٹھی پر" اپنی خفیہ پولیس کا جال مضبوط کر دیا ـــــ شہر میں افواہ اڑی کہ نظام کی اس سازش میں افواج آصفیہ کا کمانڈر میجر جنرل احمد العیدروس بھی شامل ہے ـــ مگر قاسم رضوی کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ وہ کمانڈر ہونے کے علاوہ ان کا قریبی عزیز بھی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا۔

انہی دنوں نواب زین یار جنگ بہادر اچانک دہلی چلے جانے کے لئے تیار ہو گئے ـــــ اور چلے گئے۔ ان کے دہلی پرواز کرنے کے بعد حیدر آباد کے بڑے خاص خاص حلقوں میں یہ راز فاش ہوا کہ نظام نے قاسم رضوی کے ڈر سے ہندوستان حکومت کے نام اور ان کی فوجوں کو دعوت نامہ اس "امام ضامن" میں سی کر دیا جو آغاز سفر سے قبل ان کے سیدھے بازو پہ باندھا گیا تھا۔

نواب زین یار جنگ کے تشریف لے جانے کے بعد حیدر آباد کی سیاسی فضا میں عجیب تکدر سا پیدا ہو گیا۔ عجیب عجیب وحشتناک قیاس آرائیاں ہونے لگیں مسلمانوں مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ شعیہ سنی کا سوال پیدا ہو گیا۔ اتحاد المسلمین کی قیادت

سنی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور بادشاہت شیعہ مسلمانوں کے — سنی مسلمانوں کا خیال تھا کہ شیعہ جن میں "اعلحضرت" کے علاوہ نواب زین یار جنگ، نواب ہوش یار جنگ نواب علی یاور جنگ اور دوسرے ذی اقتدار شیعہ حکومت کو ہندوؤں کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔ اور زین یار جنگ کا سفر بھی اسی لئے معنی خیز ہے۔ اسی لئے شک آمیز ہے۔

میرے ایک نمازی پرہیزگار چچا حضرت مظفر حسین صاحب نے ایک رات کوئی خواب دیکھا اور دوسری صبح ناشتہ کی میز پر انہوں نے خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔
— آزاد حیدرآباد چند دنوں کا مہمان ہے — اب وہ بچ نہیں سکتا۔
میں، میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور چھوٹے بھائی یوسف حسین زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ ہم ترقی پسند نوجوان تھے۔ خواب واب میں کوئی یقین نہیں رکھتے اور چچا اور سارے چچاؤں کو رجعت پرست اور ضعیف العقیدہ لوگ سمجھتے تھے۔

ہندوستانی فوجوں کا حملہ

لیکن اسی رات میں نے ریڈیو اسٹیشن میں بارہ بجکر کچھ منٹ پر پاکستان ریڈیو سے ایک وحشت ناک خبر سنی کہ قائداعظم محمد علی جناح رات دس بجکر ۲۵ منٹ پر اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

ریڈیو اسٹیشن کا سارا اسٹاف رو پڑا۔ دوسرے دن ریڈیو اسٹیشن دن بھر ماتمی پروگرام پیش کرتا رہا اور سارے "جنوبی پاکستان" میں گہرے سوگ اور غم کا مظاہر کیا گیا۔

میں دن بھر یہی سوچتا رہا کہ کہیں میرے محترم چچا صاحب کا خواب سچّا تو نہیں ہے ——؟؟

مجھ پر بھی عجیب ضعف سا اور کمزوری سی طاری ہو گئی تھی۔ دل بیٹھا بیٹھا سا محسوس ہوتا تھا طبیعت کچھ اتنی پریشان سی تھی۔ جیسے کچھ ہونے کو ہے۔ جیسے بہت کچھ برا ہونے والا ہے۔

قائدِ اعظم کے سوگ میں ابھی اسلامیانِ حیدر آباد کے آنسو بھی نہ سوکھے تھے کہ دوسرے ہی دن سویرے صبح ساڑھے سات بجے حیدر آباد ریڈیو نے اعلان کیا

"آج صبح ہندوستان نے اعلان جنگ کر دیا ہے اور ہندوستانی فوجوں نے پہلا حملہ ورنگل شہر پر کر دیا ہے۔"

اس خبر سے سارے شہر میں کھلبلی سی مچ گئی۔ حیدر آبادیوں کا غم و غصہ بہت تیز ہو گیا۔ قائدِ اعظم کی وفات اور ہندوستانی فوجوں کے اس اچانک حملے نے حیدر آبادی مسلمانوں کے جذبہ جہاد و شوقِ شہادت کو ایک اور مہمیز لگائی۔

میں ریڈیو اسٹیشن سے سیدھا "دار السلام" پہنچا۔ وہاں نظر حیدر آبادی اور خواجہ معین الدین پہلے ہی سے مجاہدِ اعظم کے پاس بیٹھے تھے۔ مجاہدِ اعظم رضاکاروں کی اسلحہ سے لیس وردی میں تشریف فرما تھے۔ مگر ان کے چہرے پر فکر و تردّد کی ایک شکن، ایک لکیر تک نہ تھی۔

دار السلام کا گراؤنڈ سرکاری ریلوے لبسوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن کی چھتوں پر جنگی مصلحت کی بنا پر درختوں کے پتے اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں رکھی گئی تھیں تاکہ ہندوستانی

ہوائی جہاز انہیں بس نہ سمجھیں بلکہ "چلتا پھرتا جنگل" سمجھیں۔ ان بسوں میں نوجوان تربیت یافتہ رضاکار بھرے جا رہے تھے۔ جو "ہندوستانی کافروں" سے جہاد کرنے، غازی بننے یا شہید ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ جو لوگ ان رضاکاروں کو رخصت کرنے آئے تھے۔ وہ بسوں کے جانے کے بعد زار و قطار روتے تھے۔ اور بھرائی ہوئی آوازیں میں نعرے لگاتے تھے۔

"نعرۂ تکبیر اللہ ہو اکبر"

"شاہ عثمان زندہ باد"

"آزاد حیدرآباد پائندہ باد"

حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن کی حالت بالکل ایسے ریڈیو اسٹیشن کی ہو گئی جو میدانِ جنگ کے کنارے واقع ہو۔ آغا حیدر حسن جو پہلے دہلی کی بیگماتی زبان میں تقریریں کرتے تھے انہوں نے بھی پہلی مرتبہ ایک رزمیہ تقریر براڈ کاسٹ کی۔ نظر حیدرآبادی، شاہد صدیقی اور تحسین سروری نے نہایت جوشیلی نظمیں سنانی شروع کیں۔ ابراہیم جلیس نے دس دس منٹ کی آتشیں تقریریں نشر کیں جو سننے والوں کے منجمد لہو کو کھولا دیتی تھیں

مرزا ظفر الحسن پروگرام ڈائرکٹر ہر اسٹڈیو میں چیختے پھرتے تھے کہ ایسا پروگرام لکھو جو عوام کے "مورال" کو گرنے نہ دے۔ ایسا پروگرام لکھو کہ سننے والے سر سے کفن باندھ لیں۔

ریڈیو صبح سات بجے سے رات کے بارہ بجے تک مسلسل آگ اور لوہے میں ڈھلی تقریریں اور نظمیں سناتا تھا۔ لوگ دن دن بھر دھوپ میں کھڑے رہ کر پروگرام سنتے۔ اقبال

کا وہ سارا کلام

ا۔ مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

ب۔ تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ج۔ نہیں نومید اقبال

د۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ی۔ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اضلاع سے خبریں آنے لگیں کہ ورنگل پر ہندوستانی یونین کا قبضہ ہوگیا بیدر میں ایک مسلمان بھی نہیں بچا۔ عثمان آباد میں قتل عام ہو رہا ہے۔

ہمارے سارے خاندان کے دل دھک کر رہ گئے کیونکہ میرے والد محترم اور والدہ اور چھوٹے چھوٹے بھائی چچا اور چچی سب عثمان آباد میں تھے۔ ہم نے ان کی خیریت معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کچھ بھی نہ پتہ چل سکا۔ دو روز گزر گئے۔ اتحاد المسلمین عثمان آباد کے صدر مسٹر جواد رضوی اتفاق سے عابد روڈ پر مل گئے ـــ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا کیونکہ وہ عوام سے پہلے خود ہی بھاگ آئے تھے۔ آخر بیچارے لیڈر تھے۔ لیڈر عوام کے سہارے جیتا ضرور ہے عوام کے لئے مرتا نہیں۔ جو لیڈر عوام کے لئے مرجاتا ہے۔ وہ لیڈر سیاست داں نہیں کہلایا جاسکتا۔ ہمارا سارا خاندان رونے لگا۔

بیدر کے بعد گلبرگہ کے حالات بڑے تشویشناک بتائے جارہے تھے۔ ایک شام میں گھر پہنچا تو گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ میری ساس، خسر، سالے صاحب اور خاندان کے سارے لوگ ایک اسپیشل ریفیوجی ٹرین کے ذریعے گلبرگے سے آگئے ہیں

گھر، روپیہ، مال و اسباب سب کچھ چھوڑ آئے ہیں صرف جانیں بچا کر آئے ہیں۔ میں نے اپنے منجھلے بھائی عابد حسین اور ان کی بیوی کے بارے میں پوچھا تو سلیے صاحب نے کہا کہ ہم نے انہیں شاہ آباد کے اسٹیشن پر ہماری ٹرین میں سوار ہونے کی کوشش کرتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد ہمیں نہیں معلوم —— لیکن پھر تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ وہ بھی زندہ اور صحیح سلامت ہیں۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا لیکن دل ابھی پژمردہ تھا —— والد، والدہ اور بھائیوں کی کوئی خبر نہیں ملتی تھی۔

تیسرے دن اچانک ہماری چچی اور چچا صاحب عثمان آباد کے پناہ گزینوں کے قافلے میں لٹے ہارے تباہ حال حیدر آباد پہنچ گئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ والد صاحب اور والدہ اور بچوں کو والد کے ایک ہندو دوست نے جو عثمان آباد کے وکیل تھے اور والد صاحب کے بچپن کے دوست تھے پناہ دی ہے۔ گھر بار سب جل گیا ہے اور لٹ گئے مگر وہ لوگ خیریت سے ہیں۔

میرا سر شرم سے جھک گیا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میرے والد کے وہ ہندو دوست میرے سامنے کھڑے ہیں۔

لیکن چنچولی تعلقہ (جہاں ہماری زمینداری تھی) اطلاع آئی کہ میرے ماموں مولوی عبدالمجید صاحب کو بڑی بے دردی سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے شہید کر دیا گیا ہے ان کا اکلوتا لڑکا رشید روتا ہوا بیوہ ممانی کے ساتھ ہمارے ہی گھر آگیا۔

ہمارا گھر اچھا خاصا مہاجرین کیمپ بن گیا تھا۔

اضلاع میں ہماری ساری جائیدادیں لٹ چکی تھیں۔ تباہ ہو چکی تھیں۔ البتہ سوائے

ماموں کے سارے رشتہ دار صحیح وسلامت حیدرآباد پہنچ گئے تھے۔ مگر میرا دماغ ابھی سیدھا نہیں ہوا تھا۔ کل پرزے ڈھیلے ہی تھے اور میں بڑے جوشیلے انداز میں مسلمانو کو آمادہ جہاد وشہادت کر رہا تھا۔

محاذ جنگ سے ہر گھنٹے بعد خبریں آتی تھیں کہ ہزاروں رضاکار شہید ہوئے ہیں۔ ریاستی فوج کہیں نہیں لڑ رہی ہے۔ بس پیچھے ہی پیچھے ہٹتی جا رہی ہے۔ غیر تربیت یافتہ نامکمل طور پر مسلح رضاکار آگے ہوتے ہیں اور ریاستی فوج پیچھے رہتی ہے۔ رضاکار جب کٹ جاتے ہیں تو فوج پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ ہندوستانی فوجوں کے ٹینک، ٹرک لاریاں سب پختہ سڑکوں سے بڑے اطمینان سے آگے بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔ ورنگل چلا گیا عثمان آباد چلا گیا، بیدر چلا گیا، رائچور چلا گیا، محبوب نگر چلا گیا۔

مجاہد اعظم قاسم رضوی کو بڑا غصہ آگیا۔ وہ اپنا اسٹیشن ویگن ڈرائیو کرتے افواج کے ہیڈکوارٹرس پہنچے اور کمانڈر عیدروس پر برسنے لگے۔ مگر عیدروس نے بڑی مکاری سے جواب دیا:

قبلہ یہ جنگ ہے جنگ ——— آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ میں پچھلی جنگ میں برما کا فاتح قرار دیا گیا ہوں۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہندوستانی فوجوں نے ۲۴ محاذ کھول رکھے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا فوجی جرنیل فیلڈ مارشل منٹگمری اتنے محاذوں پر نہیں لڑ سکا۔ وہ صرف تین محاذوں پر لڑ سکا ہے مگر آپ گھبرائیں نہیں ——— میں دراصل سلیٹ چھوٹا کر رہا ہوں آنے دیجئے انہیں ——— ہم اسٹالن گراڈ کی لڑائی لڑیں گے ——— پھر آپ

بمبئی کی مسجد میں، مدراس کی مسجد میں اور اللہ چاہے تو جامع مسجد دہلی میں نماز شکرانہ و نماز فتح پڑھیں گے۔

مجاہد اعظم اس جواب سے مطمئن اور سرور دار السلام لوٹ آئے اور سب سے یہی کہنے لگے ـــــ ہم اب اسٹالن گراڈ کی لڑائی لڑیں گے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے مجاہد اعظم سے عرض کی:

"امیر المومنین۔ مجھے کمانڈر عیدروس پر کچھ شبہ ہو رہا ہے۔ جانے کیوں ـــ یہ میرا دل اندر ہی اندر کہہ رہا ہے کہ ضرور اس میں کوئی سازش ہے مجھے اب نہ کمانڈر پر بھروسہ ہے۔ نہ ریاستی فوج پر ـــــ میں اس ریاستی فوج کی فطرت سے واقف ہوں۔ یہ فوج ہمیشہ دوسروں کی حفاظت کے لئے لڑتی رہی ہے۔ ہمیشہ "لندن" کے تحفظ کی خاطر میدانوں میں گئی ہے۔ آج جب کہ اس کے اپنے وطن کے لئے اس کی بہادری کی ضرورت ہے وہ پیچھے ہٹ رہی ہے ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ہماری فوج اب حیدرآباد کے لئے نہیں بلکہ دہلی کے لئے لڑ رہی ہے"

مجاہد اعظم میری اس "احمقانہ فکر" پر ہنس پڑے اور کہا:

جاؤ۔ فاؤنٹن پن سنبھالو۔ ابھی بچے ہو نا۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔

میں نے ان سے پوچھا:

میں اپنے بارے میں نہیں ان رضاکاروں کے بارے میں متفکر ہوں

جو میدان جنگ میں لڑ رہے ہیں۔"

مجاہدِ اعظم نے جواب دیا

"اللہ کا نام ان کی حفاظت کرے گا۔"

میں نے گستاخانہ لہجے میں عرض کیا:

"اللہ کا نام کوئی شیلڈ تو نہیں ہے جو گولی روک لے۔"

مجاہد اعظم نے غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا اور میں سہم کر باہر چلا آیا۔

ریڈیو اسٹیشن گیا تو معلوم ہوا کہ لوگ صبح سے ٹیلیفون پر اور بالمشافہ نیوز ایڈیٹر مسٹر عزیز رضوی کو گالیاں دے رہے ہیں —— لوگ حق بجانب تھے۔ کیونکہ ریڈیو سے رات اور دن میں کل آٹھ بار خبریں سنائی جاتی تھیں مگر خبروں میں مطلق نہیں بتایا جاتا تھا کہ ورنگل، بیدر، عثمان آباد، محبوب نگر، رائچور، ناندیڑ، پربھنی اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مواضعات پر ہندوستانی یونین کا قبضہ ہو چکا ہے۔ ریڈیو اسٹیشن ڈرتا تھا کہ کہیں ایسی خبریں سن کر حیدر آبادی مسلمانوں کا "موریل" نہ گر جائے۔ ورنگل اور عثمان آباد پر جنگ کے پہلے ہی دن قبضہ ہو چکا تھا مگر ہمارا ریڈیو یہی کہتا تھا۔ کہ ورنگل اور عثمان آباد میں ہماری بہادر فوجیں اور شیر دل رضاکار ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور دشمنوں کو پیچھے ہی پیچھے دھکیل کر آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ حیدر آبادی مجاہد اپنی لاش دے دیتا ہے مگر وطن عزیز کی چپہ بھر زمین دشمن کے قبضہ میں جانے نہیں دیتا۔

لیکن یہ پروپیگنڈا جھوٹ کی کمزور ٹانگوں پر زیادہ دیر تک نہیں کھڑا ہو سکا۔ ورنگل

عثمان آباد، محبوب نگر، بیڑ، ناندیڑ، پربھنی، رائچور، محبوب نگر سے بچے کھچے مسلمان "مجسم خبر" بن کر حیدر آباد آنے لگے تھے۔ اور جنگ کے تیسرے دن شام کو اکثر لوگوں نے اورنگ آباد ریڈیو سنا جس کی شام کی ٹرانسمیشن کا پہلا اناؤنسمنٹ تھا۔

"یہ آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد ہے۔ اب آپ جگجیت سنگھ جی
سے ہندوستانی میں خبریں سنیں۔"

حیدر آبادیوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ حیدر آباد کے تین بڑے صوبے ورنگل، گلبرگہ اورنگ آباد بھی ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اور صرف ایک صوبہ میدک اور دارالخلافہ حیدر آباد باقی رہ گئے تھے۔

لوگ دکن ریڈیو سے مایوس ہو کر ریڈیو پاکستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ حیدر آباد کے "افیونیوں" نے یہ افواہ مشہور کر دی کہ حیدر آباد پر ہندوستانی حملے کے ردّ عمل کے طور پر پاکستان نے امرتسر پر حملہ کر دیا ہے اور اس کے جنگی جہاز بمبئی پر حملہ کرنے کے لئے کراچی سے روانہ ہو چکے ہیں یہ افواہ سن کر اچھے اچھے سمجھدار تعلیم یافتہ لوگ بھی خوشی سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے مگر شام کو خبریں ہوتیں۔ پاکستان کچھ نہ بولتا۔ رات کی خبریں ہوتیں۔ پاکستان خاموش رہتا صبح کی خبریں ہوتیں پاکستان گونگے کی طرح خاموش رہتا۔ دوپہر کی خبریں حیدر آباد میں سنائی ہی نہیں دیتی تھیں۔

دارالخلافے کے مسلمانوں کا "مورال" بہت گر چکا تھا۔ لوگ صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے دن دن بھر دارالسلام میں رہتے۔ اختتام جنگ سے ایک روز قبل میں مجاہد اعظم کے پاس بیٹھا تھا ـــــ کریم نگر ضلع کے صدر مجلس اتحاد المسلمین اور رضا کاروں کے سالار آئے اور عرض کیا کہ:

"کریم نگر تباہ ہو چکا ہے۔ رضا کار جنگلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان کو واپس بلوانے کے لئے یہاں سے موٹریں اور بسیں بھیجی جائیں۔"

مجاہد اعظم نے ریاست بھر کے رضا کاروں کے سالار اعلیٰ مسٹر بشیر احمد کو بلایا اور حکم دیا:

"کریم نگر کو دس لاریاں اور بسیں بھیج دو۔"

ریاست بھر کے رضا کاروں کے سالار اعلیٰ نے فرمایا:

"میں نے انتظام کر دیا ہے۔ وہ رضا کار ریل سے آجائیں گے۔"

مجاہد اعظم نے غصہ سے "پیپر ویٹ" دیوار پر دے مارا اور چیخ کر بولے:

تم رضا کاروں کے سالار اعلیٰ ہو۔ تم یہ بیہودہ بات کرتے ہو۔۔۔ کیا کریم نگر کوئی ریلوے اسٹیشن ہے۔ کیا کریم نگر کے پاس تمہارے باپ دادا نے ریلوے لائن بنائی ہے؟"

ریاست بھر کے رضا کاروں کے سالار اعلیٰ نے اپنا سر شرم سے جھکا لیا مجھے بھی اس منحوس پر بڑا غصہ آیا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا گلا دبا دوں۔ رضا کاروں کی قومی فوج کا کمانڈر بنا ہے اور اسے خود اپنے میدان جنگ کا نقشہ تک نہیں معلوم۔ اس نامعقول کو یہ تک معلوم نہیں کہ کریم نگر ریلوے سٹیشن نہیں ہے ——!!

میں "آزاد حیدر آباد" کی زندگی سے مکمل طور پر مایوس ہو گیا۔ تھوڑی بہت امید تھی لیکن ریاست بھر کے رضا کاروں کے سالار اعلیٰ کی اس جنگی قابلیت کو دیکھ کر وہ رہی سہی امید بھی مر گئی۔

وہ رات حیدرآباد کی آزادی کی آخری رات تھی۔ وہ رات "بیمار" پر بہت بھاری تھی ہم لوگ بڑے ڈسپیریٹ ہوکر پروگرام لکھ رہے تھے۔ نشر کر رہے تھے۔ رات ساڑھے نو بجے کے بعد تو ہم سب نوجوان مقررین ریڈیو مائیکروفون سے ہندوستانی حکومت کو، ہندوستانی لیڈروں کو، ہندوستانی فوجوں کو کھلم کھلا گالیاں بکنے لگے۔

اچانک ہوائی خطرے کا سائرن بجا۔ اور سارے ریڈیو اسٹیشن کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ ہندوستانی یونین کا ایک ہوائی جہاز دو گھنٹے تک ریڈیو اسٹیشن کے سر پر چکر کاٹتا رہا۔ کبھی بہت نیچے آجاتا۔ کبھی بہت اوپر چلا جاتا۔ ہم سب یار دوست آپس میں لپٹ لپٹ کر خوب گلے ملے۔ کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ابھی اوپر ایک بم گرے گا اور ہم سب ریڈیو کی بلڈنگ کے ملبے میں دب کر مر جائیں گے۔ ہماری آنکھوں میں بیوی بچوں، ماں باپ، بھائیوں کی صورتیں گھوم رہی تھیں —— افسوس کہ گھروں کو وصیت بھجوانے کا بھی کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ اسٹڈیو میں گھسیں اور مائیکروفون سے اپنے لواحقین کو "وصیت" بھی کر دیں۔

ہوائی جہاز بس چکر ہی کاٹے جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نوجوان پائلیٹ نے نئی نئی شادی کی ہے اور اپنی دلہن کے ساتھ "ہنی مون" منانے چاندنی رات میں حیدرآباد کی فضاؤں میں چلا آیا ہے —— کیونکہ یہ ایلورہ اجنتا کی سرزمین ہے

وہ ہوائی جہاز غالباً "بامبر" نہیں تھا۔ غالباً "فائیٹر" تھا یا نہ بامبر تھا نہ فائیٹر —— بس صرف ہوائی جہاز تھا جو یونہی تفریحاً حیدرآبادی شجاعت یا حیدرآبادی "اینٹی ایرکرافٹ" کا امتحان لینے آیا تھا —— اور اسی دن ہمیں پتہ چلا تھا کہ حیدرآباد کے

پاس صرف ایک "اینٹی ایر کرافٹ گن" ہے مگر وہ بھی بس یونہی ہے۔

خدا خدا کر کے دو گھنٹے بعد وہ جہاز سروں پر سے ٹلا ہوگا "سائیرن" ڈپارٹمنٹ شاید خطرے کا سائیرن بجا کر سو گیا تھا۔ صبح سات بجے تک اس نے "آل کلیر" کا سائیرن ہی نہیں دیا۔ اور ہم رات بھر ریڈیو اسٹیشن میں خوف اور دہشت کے مارے جاگتے رہے اور گھبراتے رہے۔ صبح ہوئی۔ ہم گھر لوٹے۔ لوگ کہہ رہے تھے۔ کہ وہ ہوائی جہاز ہندوستان کا نہیں تھا۔ ہمارا اپنا تھا۔ جو "ریہرسل" کے لئے پرواز کر رہا تھا۔ ہم نے ایک بہت بڑے فوجی افسر سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے ہمیں ایک نہایت حیرت انگیز بات بتائی۔ کہ حیدر آباد کے پاس کوئی "ہوائی فوج" نہیں ہے۔ ہمیں یہ راز سن کر بڑا غصہ آیا —— شدت غصہ سے میرا ذہنی توازن غائب ہو گیا تھا۔ میں اتحاد المسلمین کے ایک ذمہ دار لیڈر سے جھگڑ پڑا کہ جب آپ کے پاس کوئی ہوائی فوج نہیں، اینٹی ایر کرافٹ گن تک نہیں تو پھر یہ بلند آہنگ دعوے کیوں کئے جاتے رہے —— کیا صرف پروپیگنڈا اور اعصابی جنگ سے کوئی میدان جیتا جا سکتا ہے —— ؟؟

مگر جواب دینے کی کسے فرصت تھی۔ آخری وقت آچکا تھا۔ اور ہندوستانی فوجیں حیدر آباد شہر کے اطراف بیس پچیس میل دور رہ گئی تھیں۔

حضور نظام، زین یار جنگ اور کمانڈر افواج آصفیہ احمد العیدروس کی غداری کے قصے زباں زد خاص و عام ہو گئے تھے۔ حیدر آبادی مسلمانوں میں سراسیمگی، گھبراہٹ اور دہشت پھیل گئی تھی۔ "مورال" تو بالکل ہی گر چکا تھا۔

ٹیپو کی دوسری موت

وہ جمعہ کا دن تھا۔ عید المومنین یا قیامت المومنین۔ آزاد حیدر آباد کا آخری سورج طلوع ہو چکا تھا۔

حیدر آباد ریڈیو سے حسب معمول دن کے دس بجے سے بارہ بجے تک خواتین کا پروگرام ہوا کرتا تھا۔ لیکن کوئی خاتون پروگرام کے لئے تشریف نہیں لائی تھیں — لوگ ٹیلیفون پر ریڈیو کے ارباب اقتدار کو گالیاں دے رہے تھے۔

مرزا ظفر الحسن نے اشتیاق حسین، ع احمد، ایم۔ اے رؤف وغیرہ سے مشورہ کیا کہ میر لائق علی اور مجاہد اعظم کی تقریریں نشر کرائی جائیں تاکہ مسلمانوں کے دل میں پھر سے امید، زندگی اور ہمت پیدا ہو۔

میر لائق علی شاہ منزل میں نہیں تھے۔ دار السلام میں نہیں تھے ان کی بڑی تلاش کی گئی۔ آخر کار پتہ چلا کہ وہ درگاہ یوسف صاحب شریف صاحب رح میں بیٹھے ہیں اور محو عبادت ہیں۔

اللہ ——— اللہ ——— اللہ

ہم ان سے مایوس ہو کر مجاہد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے مجاہد اعظم نے آدھے گھنٹے کے اندر ریڈیو اسٹیشن پہنچنے کا وعدہ کیا۔

ادر ادھر ریڈیو اسٹیشن میں اس آدھے گھنٹے کے دوران میں مرزا ظفر الحسن، مس جہاں آرا جدی، محمود عبد الماجد بدر رضوان سبھوں نے باری باری کوئی پچاس بار اعلان دیا کہ

مجاہدِ اعظم اسلامیان ارضِ دکن کو آخری بار مخاطب فرمانے والے ہیں۔

جب کے۔ ایل۔ سہگل یاس آگیں آواز میں مسلمانانِ دکن کو

کاہے ہوت اداس پنچھی

پنجرا لے کر اڑ جا پنچھی

کی ڈھارس دینے کی ناکام کوشش کے بعد خاموش ہو گیا تو مرزا ظفر الحسن کی آواز مجاہدِ اعظم کے نام کا سارا شکوہ لے کر گونجی ——— سارا گھر۔ سارا شہر ریڈیو کے گرد جمع ہو گیا۔ مجاہدِ اعظم کی آواز بھرائی ہوئی تھی:

"آزاد دکن کے آزاد باشندو!

میں آزاد حیدر آباد کے آزاد ریڈیو سے آخری بار آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔ آپ ایک سال تک آزادی کی زندگی بخش چھاؤں میں آزاد زندگی سے ہم آغوش تھے مگر آج کے بعد کل"........

کل ——— ؟؟؟

مجاہدِ اعظم کی آواز عورتوں مردوں اور بچوں کی بلند چیخوں اور آہ و زاری میں گم ہو گئی ——— آنے والا "کل" "نالہ و شیون" میں پھنس کر رہ گیا۔ طلوع ہی نہ ہو سکا۔ اور اب شاید اس "کل" کا طلوع بھی مجاہدِ اعظم کے قبضہ و اختیار سے باہر تھا۔

میں چپ چاپ اپنا کوٹ کندھے پر یونہی ڈال کر باہر نکل گیا۔ خیریت آباد سے

سے حیدر آباد گوڑے تک ۔ حیدر گوڑے سے عابد روڈ تک، عابد روڈ سے دارالسلام تک مسلمانوں کا ہجوم ہی ہجوم تھا۔ مسلمانوں کی ساری دکانیں بند تھیں، البتہ درزیوں کی ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں جن کے آگے بنجارہ ہل، خیریت آباد خلوت شاہی، سوماجی گوڑہ امیر پیٹھ، حمایت نگر اور کنگ کوٹھی روڈ کے مسلمان نوابوں، جاگیرداروں، امیروں، سرمایہ داروں اور تاجروں کی کاریں کھڑی تھیں۔ اور یہ اطلس و کمخواب کی شیروانیاں اور مصری بانات کی ترکی اور رومی اور بصری ٹوپیاں پہننے والے نواب جاگیردار اور رئیس اب "ہند وضع" کے کرتوں، جاکٹوں بش شرٹوں اور سوٹوں کا ناپ دے رہے تھے۔ "تپنگے برادرس ریڈی میڈ کلاتھ مرچنٹس" نے اپنی دکانوں میں گاندھی ٹوپیوں اور ترنگے جھنڈوں کا انبار لگا رکھا تھا

میں اپنے محبوب ہوٹل "نظامیہ ہوٹل" میں چائے پینے چلا گیا۔ اس ہوٹل کے بیرے، پان والا، سگریٹ والا، سائیکل حفاظت والا، باورچی سب میرے گرد جمع ہو گئے۔ اور پوچھنے لگے:

"صاب ——— بتاؤ اب کیا ہوگا۔

میں ایک سگریٹ جلا کر بید کی آرام کرسی پر گر گیا۔ کچھ نہ سنا کچھ نہ بولا اسی اثنا میں میرا جگری دوست تاج شہریار جو ریاستی فوج میں سیکنڈ لفٹنٹ تھا میری تلاش میں وہاں آیا اور تقریباً آبدیدہ ہو کر بولا:

"جلیس پیارے ——— آزاد حیدر آباد مر گیا۔ حضور نظام نے اپنی فوجوں کو حکم دے

دیا ہے کہ آج سہ پہر وہ ہندوستانی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں"۔

میں نے غصے سے اٹھ کر تاج شہریار کے دونوں کندھے پکڑ لئے۔ اور غضبناک نگاہوں سے بڑی دیر تک اسے گھورتا رہا۔

ہم دونوں باہر نکلے۔ اور قدم قدم پر ہمارے کانوں سے ایک ہی آواز ٹکراتی تھی۔

"سیز فائر"

"سیز فائر"

"سیز فائر"

اب فضا میں "اللہ اکبر" کا نعرہ نہیں تھا۔ "شاہ عثمان زندہ باد" کی چیخیں نہیں تھیں۔ "آزاد حیدرآباد پائندہ باد" کا شور نہیں تھا۔ صرف ایک ہی نعرہ تھا۔ ایک ہی چیخ تھی۔

"سیز فائر"

میں، نظر اور خواجہ معین الدین، تاج شہریار، احمد عبدالقیوم، مصطفیٰ اور مجاہد اعظم سے ملنے دارالسلام کی طرف گئے۔ دارالسلام کے پھاٹک پر پہنچے ہی تھے کہ ریاض فرشوری ملا۔ جو روتا، آنسو پونچھتا باہر نکل رہا تھا۔ اندر ہنگامہ، گڑبڑ، بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ مجاہد اعظم نے سارے "دارالسلام" کو لوٹ لینے کا حکم دے دیا تھا۔ لوگ موت کے ساحل پہ بھی لوٹ مار میں مشغول تھے۔

جس کے ہاتھ میں جو چیز آتی اٹھا اٹھا کر بھاگ رہا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں کرسی تھی کسی کے پاس اسٹین گن تھی۔ کوئی پستول لئے بھاگ رہا تھا۔ کوئی پٹرول کے ڈبے اٹھائے لئے جا رہا تھا۔ کوئی چاول کا تھیلہ لئے بھاگ رہا تھا۔ کسی کے سر پر آٹے کی بوری تھی۔

اور "انسانیت" بڑی فسردہ نگاہوں سے بڑی افسوس ناک نظروں سے موت کے ساحل پر لوٹ مار مچانے والے انسانوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو ابھی دنیا کو لوٹ رہے ہیں۔ اور ر ابھی کہ ابھی موت انہیں لوٹ لے گی۔

مجاہد اعظم ایک مرتی ہوئی قوم کے سراسیمہ ہجوم میں جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھپ گئے تھے۔

ناچار ہم واپس ہو گئے۔ راستہ میں نظر حیدر آبادی کا گھر تھا۔ ہم نے سوچا چلو نظر کے والد محترم حضرت علی اختر صاحب قبلہ سے بھی مل لیں۔ حضرت علی اختر جو اردو شاعری کے اساتذہ میں سے ہونے کے باوجود حیدر آبادی سیاست کے بڑے اہم رکن تھے، بڑے اطمینان سے بڑی شفقت سے ہمیں دلاسا اور حوصلہ دیتے رہے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ شام کے چار بجے میر لائق علی دکن ریڈیو سے آخری تقریر نشر کریں گے۔

ہم سب ورانڈے میں چپ چاپ بیٹھے سامنے سڑک پر سے گزرنے والی ان ٹرکوں، لاریوں اور بسوں کو دیکھتے رہے۔ جو محاذ جنگ سے واپس آرہی تھیں، جو

یہاں سے سگریٹ کے پیکٹوں کی طرح بھر بھر کر بھیجی گئی تھیں. اب بالکل خالی واپس آرہی تھیں۔

چار بجے ہم سب ریڈیو سٹ کے گرد جمع ہو گئے. میر لائق علی تقریر فرما رہے تھے۔

"میرے عزیز حیدرآبادی باشندو!

آج میں نے اور میری کابینہ نے حضور اعلیحضرت کے حکم پر استعفےٰ پیش کر دیئے ہیں۔ آج کے بعد سے آپ کو یقیناً ایک نئی اور مختلف طرز زندگی کو اختیار کرنا پڑے گا لیکن یاد رکھئے۔ آپ حیدرآبادی ہیں۔ حیدرآبادی روایات کو کبھی اپنے کردار سے جانے نہ دیجئے۔ اب تک اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ آپ جس میل ملاپ اور فرقہ وار ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ آیندہ بھی اسی طرح رہیئے۔" میرا صرف یہی پیغام ہے۔ خدا حافظ۔"

خلاف توقع ہم میں سے کسی نے بھی اس تقریر پر کوئی "کمنٹ" نہیں کیا. بس چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اور اپنے آپ میں ڈوبے رہے۔

اسی دوران میں باہر سے کوئٹہ کا پٹھان افضل خان جو علی اختر صاحب سے لے کر نظر حیدرآبادی تک سب کا بے تکلف دوست تھا۔ باہر سے آیا اور بولا:

"ہمارے بہادر کمانڈر صاحب نے سکندرآباد سے چار میل

آگے جاکر ہندوستانی فوجوں کا استقبال کیا۔ اور ان
کے قدموں میں ہتھیار پھینک کر اپنا بلیٹ میجر جنرل
جے۔ این چودھری کے حوالے کر دیا"۔

میں نے کہا:

ہاں اس نے مجاہد اعظم سے ایک بار کہا تھا۔ کہ میں ۲۷
محاذوں پہ نہیں لڑ سکتا۔ "بلیٹ" چھوٹا کر رہا ہوں
اور آج اس نے "بلیٹ" دے دیا ——— وہ بیچارا
بھی آخر کیا کرتا۔ فیلڈ مارشل منٹگمری تین محاذوں
سے زیادہ پہ نہ لڑ سکا۔

ہمارے ایک بیوقوف سادہ لوح دوست (جن کا نام نہیں بتاؤں گا) ایک عجیب راز کو منکشف کیا۔ کہ کمانڈر کی ایک بیوی "یاہودن" بھی ہے۔ نظر نے پوچھا۔

تو پھر کیا ہوا ——— ؟

جناب سادہ لوح نے جواب دیا

"یہی تو بات ہے۔ یہی تو سب کچھ ہوا ہے ہندوستان
فلسطین کے معاملے میں یہودیوں کا طرفدار اور عربوں
کے خلاف تھا۔ انہوں نے حیدرآباد کے کمانڈر کو
دیکھا۔ جس کا گھر "عجیب و غریب قسم کا فلسطین"

بنا ہوا ہے ـــــــــ میاں عرب اور بیوی یہودن

ـــــــــ انہوں نے اس کی بیوی کو رشوت

دے کر اپنی طرف کر لیا تھا۔ جو سارے راز ہندوستان

کو پہنچاتی رہی"۔

ہنسنے کا کوئی موقعہ نہیں تھا۔ ہم سب ہنس پڑے۔ سوچا کہ کیوں نہ ہنستے ہوئے مریں۔ روتے ہوئے تو سبھی مرتے ہیں۔

ابھی ہمارے قہقہے نہ رکے تھے۔ کہ سکنڈ لفٹننٹ "تاج شہریار" وہاں آیا اور اس نے تازہ ترین سرکاری اور فوجی اطلاع ہمیں دی کہ ہندوستانی فوجیں شام تک شہر میں داخل ہو جائیں گی۔ اور ان کے داخل ہوتے ہی۔ اتحاد المسلمین کے لیڈروں اور رضاکاروں کی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔

یہ خبر سنتے ہی نظر کے گھر کے اندر کہرام مچ گیا۔ اس کی بیوی رونے لگی۔ اس کی بچی اس کے گلے سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں اور علی اختر صاحب بھی اپنے آنسو نہ ضبط کر سکے۔ اب ہماری آنکھوں کے سامنے یا تو موت تھی یا جیل کی دیواریں۔ علی اختر صاحب نے مشورہ دیا کہ تم سب لوگ اب "زیر زمین" چلے جاؤ۔ قسمت میں جو ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی۔ مگر انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر سوچنی چاہیئے۔

نظر حیدر آبادی کو علی اختر صاحب نے شہر کے دور و دراز کے محلے مغلپورہ میں ایک دور کے عزیز کے ہاں بھجوا دیا۔ نظر جب پڑوسے لگے ہوئے ٹانگے میں

بلبٹھ رہا تھا۔ ہم سب گویا آخری بار خوب لپٹ لپٹ کر گلے ملے۔ میں نے جواب دیا
"میں 'انڈر گراؤنڈ' نہیں جاؤں گا۔ مجھے موت بھی منظور ہے
اور جیل خانہ بھی۔"

میں بھی ایک زنانی رکشا میں چھپ کر گھر لوٹ گیا۔ سڑکوں پر کوئی مسلمان نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ ہندو سلطان بازار اور گولی گوڑہ کی قیدوں اور قلعوں سے باہر نکل آئے تھے اور فضا میں نعروں کا شور تھا۔ ہندوستان کی "فورس آف لبریشن" حیدر آباد کے شہر میں داخل ہونے ہی والی تھی۔ اور حیدر آباد کے ہندو محلہ سلطان بازار کے گھنٹہ گھر سے ایک بڑا جلوس نکال کر شہر کے بڑے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ جلوسیوں کے پاس پھول تھے۔ خوشی کے نعرے تھے۔ مگر جلوسی نہ صرف "جے ہند" کے نعرے لگا رہے تھے۔ بلکہ "نظام مردہ باد" کے نعرے بھی کنگ کوٹھی مبارک کے در و دیوار ہلا رہے تھے۔ حالانکہ حضور نظام نے اپنی پیاری ہندو رعایا کو مسلمانوں کے مظالم سے بچانے کے لئے ہندوستانی افواج کو دعوت دی تھی۔ ہندوستانی افواج جو حیدرآباد کی باشندوں کے لئے جمہوریت اور "حلوہ سوہن" لا رہی تھیں۔ جو حیدرآباد کی عوام کو مطلق العنان جاگیردارانہ فسطائی نظام سے نجات دلانے اور "حضور نظام" کے محل اور خزانے کی حفاظت کرنے آ رہی تھیں۔

فوجی جمہوریت

رات کا اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ میں فاطمہ کے پاس چپ چاپ بیٹھا سگریٹ

پر سگریٹ پی رہا تھا ——— اس وقت میرا چھوٹا بھائی یوسف باہر سے آیا اور اس نے بتایا کہ:

"مجاہدِ اعظم نے زہر کھا لیا"۔

میرا ایک اور بھائی "فاروق حسین" بھی باہر سے آیا۔ اس نے اس خبر کی تردید کی۔ اور بتایا کہ سڈنی کاٹن آیا ہوا ہے۔ اور وہ میر لائق علی اور مجاہدِ اعظم قاسم رضوی کی منتیں کر رہا ہے کہ آئیے اب میرے حقِ نمک ادا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ میں آپ دونوں کو بلا خطر پاکستان پہنچا دوں گا۔

فاروق نے بتایا کہ مجاہدِ اعظم نے اور میر لائق علی نے سڈنی کاٹن کو جھڑک دیا اور کہا:

"اب ہم یہیں سارے مسلمانوں کے ساتھ مریں گے۔ ہاں جو جانا چاہتا ہے۔ اسے لے جاؤ۔ ہم نہیں آئیں گے"۔

فاروق حسین میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے۔ اس نے بتایا کہ آج بہت سے لوگ ہمارے کالج اور ہسپتال سے "پوٹاشیم سائنائیڈ" لے گئے۔ اور اپنی عورتوں کو زہر دے رہے ہیں ——— اور اس کے بعد ان کا ارادہ ہے کہ ہندوستانی فوجوں کے داخل ہوتے ہی حیدرآباد کو "میدانِ کربلا" بنا دیا جائے۔

حالانکہ حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان سچ مچ ایک "میدانِ کربلا" عرصے سے ہے۔ جہاں ہمیشہ کارنیوال، وہائٹ سٹی، تھیٹر اور سرکس کے تماشے لگتے ہیں اور اب بھی "میدانِ کربلا" میں ایک تماشہ ہی ہو رہا تھا۔ البتہ تماشہ کی

نوعیت ذرا مختلف تھی۔ پہلے تماشے صرف تفریح اور عیاشی کے لئے ہوتے تھے اب تماشہ "غلط سیاست" کا مذاق اڑا رہا تھا۔

اس وقت میرے پڑوسی حمید خاں کی چھوٹی بچی مجھے بلانے آئی کہ ضروری کام ہے۔ میں اس کے گھر گیا۔ تو وہاں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ حمید خاں اپنی نوجوان لڑکی جمیلہ کے سامنے زہر کی شیشی اور پانی کا گلاس لئے کھڑا تھا۔

اور وہ چیخ رہی تھی

"نہیں۔ نہیں ——— میں زہر نہیں کھاؤں گی۔ ابا جی

میں ابھی مرنا نہیں چاہتی"

مگر میرا پڑوسی حمید خاں اسے بڑے ولار سے، بڑے پیار سے بھرائی ہوئی آواز میں چمکار رہا تھا۔

"بیٹی ——— تو مسلمان زادی ہے۔ تو حضرت عائشہ

صدیقہ کی اولاد میں سے ہے۔ تو فاطمہ بنت عبداللہ

کی مثال ہے ——— بیٹی ——— اب تیری

عصمت اور ہماری عزت زہر کی صرف ایک بوند

میں جمع ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمت سے کام لے۔ جی

کڑا کر کے پی جا میری بچی۔ بسم اللہ"

لڑکی اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں اُمڈ آئے ہوئے آنسوؤں کی چلمن سے تھوڑی دیر تک کانچ کے اس گلاس کو دیکھتی رہی جس سے اس کی موت یا اس کی

عصمت سبز پانی بن کر جھلک رہی تھی۔

لڑکی ——— سولہ سال کی بھرپور پکی پکائی جوانی، مرمر سے تراشی ہوئی جوانی ——— جس کے محبوب منگیتر کی لاش عثمان آباد کے کسی کھیت کی مینڈھ پر رضاکارانہ وردی میں پڑی سڑ رہی ہوگی ———

تھوڑی دیر تک جیسے حدِّ نظر سے بھی پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمکیلا ماضی تھا۔ وہ جیسے اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنے ماں باپ سے چھپ کر کھڑکی سے جھانک رہی ہے۔ اپنے محبوب کے لئے شرمیلی مسکراہٹ کا جال بن رہی ہے۔ چھپ چھپ کر محبت بھرے خطوط لکھ رہی ہے۔ رات کے اندھیرے میں دنیا کی نظروں سے چھپ کر اپنے محبوب سے ملی ہے۔ جو رضاکاروں کی وردی میں سجا، تنا اور اکڑا اکھڑا ہے۔ اور جو صبح گجر دم حیدر آباد کی اسلامی سلطنت کو ہندوستانی حکومت کے کافروں کی یلغار سے بچانے کیلئے میدان جنگ کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ اس کا محبوب اس کے اچھوتے ہونٹوں پر محبت کا پہلا نقش ثبت کرتا ہے۔ اور اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتا ہے۔ وہ رونے لگتی ہے ——— اپنے محبوب کو ہمیشہ کے لئے جدا ہوتا ہوا دیکھتی ہے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی گہری دھند چھا جاتی ہے اور اس دھند میں اس کا محبوب چھپ جاتا ہے ——— کھو جاتا ہے۔

اور اب اس کی آنکھوں کے سامنے سبز پانی کا کانچ کا گلاس ہے۔ اور اس کا

باپ اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اس سے التجا کر رہا ہے۔

بیٹی ——— ابھی تھوڑی دیر میں ہندوستانی فوجیں

شہر میں داخل ہو جائیں گی۔ اس کے بعد ———

اس کے بعد

اس کا گلا بری طرح رندھ گیا۔ اور لڑکی محبت کے ماضی کے محل کے سارے پُرفسوں کمرے جھانکتی اور پھر اپنے باپ کے سامنے سر جھکائے آنسوؤں کے اُفق سے پرے "زہرآب" کو تکنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک آپ ہی آپ کچھ باتیں کرتی رہی۔ صرف اس کے ہونٹ ہلتے رہے۔ پھر اس کے بعد اس نے اپنے سر پر سفید جگمگاتے تاروں والا سیاہ دوپٹہ اوڑھ کر اللہ کا نام لے کر وہ سبز پانی والا کانچ کا گلاس پی لیا۔

اور حمید خاں غم و خوشی کی وادی میں پکار اٹھا۔

"شاباش بیٹی ——— شاباش"

پھر کانچ کا گلاس ٹوٹ گیا۔ وہ کانچ کا گلاس جس کو میرے غریب پڑوسی حمید خاں نے سولہ سال سے بڑی محنت سے بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ کانچ کے گلاس کے ٹوٹنے کی آواز معاً کئی آدمیوں کے رونے اور چیخنے کی آوازوں میں بدل گئی۔ حمید خاں کے گھر کہرام مچا ہوا تھا اور میرے گھر ریڈیو بج رہا تھا۔ وہ ریڈیو جو روزانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا تھا جس پر ہمیشہ

"اللہ ہو ——— اللہ ہو"

کے ریکارڈ بجا کرتے تھے۔ اب اس ریڈیو سے یہ ریکارڈ بج رہا تھا۔

رگھوپتی رگھوپتی راجہ رام

پتی پتاون سیتا رام

فاطمہ بار بار پوچھ رہی تھی۔ کہ اب کیا ہو گا ——— ؟ اب کیا ہو گا ——— ؟؟

——— اب ایک لمبی رات آئے گی۔ ایک بیکراں اندھیرا پھیلے گا۔ ایک پُر شور اندھیرا جو چیخوں اور نعروں کے شور سے متلاطم ہے۔ کل تک "اسی اندھیرے" میں اللہ اکبر اور شاہ عثمان زندہ باد کے نعرے گونجتے تھے۔ اب یہ "اندھیرا" ——— "جے ہند اور سردار پٹیل کی جے" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ اسی اندھیرے میں میں ریڈیو سٹ کے قریب بیٹھا لیڈی اناؤنسر مس جہاں آرا جذبی کی آواز سن رہا تھا۔ جو ہر پانچ منٹ بعد اعلان کر رہی تھی۔ کہ ٹھیک آٹھ بجے "اعلیٰ حضرت حضور نظام" اپنی پیاری رعایا کو مخاطب کرنے کی عزت بخشیں گے۔

ٹھیک آٹھ بجے ہز اگزالٹیڈ ہائی نس، سابق ہز مجیسٹی، جلالتہ الملک مظفر الملک، سلطان العلوم، فاتح دوراں، نوشیرواں زماں، امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، "یار وفادار سرکار انگلشیہ" حکیم السیاست اعلیٰ حضرت بندگان عالی سلطان ابن سلطان، خاقان ابن خاقان، نواب سر میر عثمان علی خاں نظام الملک آصف جاہ سابع شہریار دکن دبرادہ خلد اللہ و ملکہ و سلطنتہ اپنی باسٹھ سالہ

بوڑھی اور مکروہ آواز میں اپنی پیاری رعایا کو مخاطب فرمانے کی عزت حاصل فرما رہے تھے:

"میری عزیز رعایا!

پچھلے چند مہینوں میں قاسم رضوی ہٹلری ہتھکنڈوں سے میری ریاست پر قابض ہو گیا تھا اور اس نے میری عزیز ہندو رعایا پر بے انتہا مظالم ڈھا رکھے تھے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھیں سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں نے ہندوستان کی فوجی امداد طلب کی ہے"

قاسم رضوی میری سلطنت کو اسلامی مملکت اور جنوبی پاکستان بنانا چاہتا تھا۔ مگر یہ اسلامی مملکت کیسے بن سکتی تھی جب کہ یہاں تیرہ فی صد مسلمان اور ۸۶ فی صدی ہندو بستے ہیں۔ اس لئے قاسم رضوی کی ہٹلریت ختم کرنے کے لئے ....

میرے بڑے چچا نے جھلا کر ریڈیو کا سوئچ آف کر دیا۔ میرا چھ سالہ ننھا بچہ شہریار جلیس گویا شہریار دکن کی جبونڈی آواز اور سفید جھوٹ پر ہنس پڑا۔

حیدرآباد جیسے بہرا ہو گیا تھا۔ اس کی سلطنت کی وہ مسلمان عورتیں جنہوں نے

چاند بی بی بن کر، سلطانہ رضیہ کا روپ دھار کر، فاطمہ بنتِ عبداللہ کی جوُن میں آ کر اپنے نوجوان بیٹوں، بھائیوں، شوہروں اور محبوبوں کے جسموں پہ رضاکار وردی سجا کر جنگ کے میدانوں میں بھیجا تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لئے تھے۔ حیدرآباد کے وہ جیالے بیٹے جو عبدالرزاق لاری کا جگر اور شیر دل ٹیپو کی تلوار لئے ہندوستانی فوج کے ٹینکوں، دبابوں، بمبار طیاروں، مشین گنوں اور توپوں کے سامنے مسکراتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ وہ روحیں اور وہ عشقِ براہیمی جو آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑا تھا۔ اب اس مائیکروفون کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ جہاں حضور نظام کھڑا حکومت ہند کے سرکاری کاغذ پہ لکھی ہوئی ایک تقریر پڑھ رہا تھا۔

وہ رضاکار جو نہتے، صرف ذوقِ شہادت سے مسلح ہندوستانی دبابوں اور ٹینکوں کے پہیوں میں گھس کر ان کی زنجیریں اتار لیتے تھے۔ وہ رضاکار جو ہندوستانی بکتر بند گاڑیوں اور جیپ کاروں کے سامنے زندہ لیٹ گئے تھے تاکہ ہندوستان کے قدم رُک جائیں۔ اسے حیدرآباد پہنچنے میں دیر ہو —————— وہ رضاکار جن کی بہادر لاشیں کھیتوں میں، راستوں پہ، میدانوں میں، پگڈنڈیوں پہ بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی روحیں فریاد کناں تھیں۔ کہ آزاد حیدرآباد کہاں ہے؟ اور وہ کس کی آزادی کی قربان گاہ پہ بھینٹ چڑھائے گئے۔ سادہ لوح نوجوان لڑکے جن کے مضبوط جسموں اور گرم جوشیلے خون کو مذہب کی بھٹی میں دھکایا گیا تھا۔ جن کو خدا کے نام پہ، مذہب کے نام پہ، قرآن کے نام پہ، محمدؐ کے

نام پر، طارق و ٹیپو کے نام پر، اقبال اور جناح کے نام پر، جنوبی پاکستان کے نام پر اور اس جادوگر کے نام پر جس نے اپنی زنّار فرغل کو اسلامی لبادے میں چھپا رکھا تھا۔ تاکہ اس کا محل، اس کا خزانہ اور اس کی جاگیر محفوظ رہے ————

اسی جادوگر کے نام پر جذباتی نوجوانوں کی زندگیاں چھین لی گئیں۔ وہ جب اپنے پیاروں سے دور کھیتوں اور میدانوں میں گولی کھا کر گر پڑتے تھے۔ تو ان کے حلق سے صرف ایک نعرہ ابلتا تھا۔

شاہ عثمان زندہ باد

اور یہ نعرہ ———— یعنی شاہ عثمان ان کی آخری سانس بھی ان کے جسم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باہر کھینچ لیتا تھا۔

ایک دو نہیں ———— چالیس ہزار لاشیں "ظل الہٰی" کے گھناؤنے سائے میں پڑی سڑ رہی تھیں اور اسی گھناؤنے سائے میں اب سارا حیدرآباد ڈوب چکا تھا۔ کہیں کوئی ستارہ نہیں چمکتا تھا۔ کہیں کوئی مشعل راہ نہیں تھی۔ کہیں کوئی آویزہ نہیں جگمگاتا تھا۔ کہ راستہ سجھائی دے سکے۔

اندھیرا۔ گھور اندھیرا۔ گھپ اندھیرا

اسی گھپ اندھیرے میں چمکیلے ہیروں کی انگوٹھیوں والے دو ہاتھ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ دو سرمایہ داروں کے ہاتھ۔ دو سازشیوں کے ہاتھ ————

ایک ہاتھ کنگ کوٹھی حیدرآباد کی طرف سے بڑھا۔ دوسرا ہاتھ "نہرو پیلس" دہلی کے دریچے سے بڑھا۔ دونوں ہاتھ ملے۔ اوپر ہی اوپر، اندھیرے میں۔ اور کسی کو کچھ نہ

سجھائی نہ دیا۔ کچھ نہ دکھائی دیا کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کس طرح ایک ہوگئی ہے اور اندھیرے کی کمین گاہ میں چھپ کر کس طرح عوام کا اور انسانی جوانی کا لہو پی رہے ہیں۔

اور نیچے سطح زمین پر انسان مر رہا تھا۔ دہلی، مشرقی پنجاب، بہار، نواکھالی، گوالیار پٹیالہ، ناگپور اور برار کے مسلمان پناہ گزین جو ——— مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی ——— کا فریب کھا کر حیدرآباد آگئے تھے۔ اب پناہ گزینوں کے سرکاری کیمپوں سے بھاگ کر شہر کے محلوں میں اور سڑکوں پہ پھیل گئے تھے۔ کیونکہ سکندرآباد میں فرقہ وارانہ فسادات ہو گئے تھے۔ اور "مہاجرین" سے حیدرآبادی ہندوؤں کو شدید نفرت تھی۔

آریہ سماجی اور سیوک سنگھی غنڈے سڑکوں پر شور مچا رہے تھے۔

ایک کا بدلہ تین تین

مارو مسلمین۔ کاٹو مسلمین

ایک کا بدلہ تین تین

اعظم جاہی روڈ پر دہلی کے مہاجر مسلمان نے جو "دہلی مسلم ہوٹل" قائم کیا تھا۔ اب اس نے اپنا سائن بورڈ اتار کر پچھواڑے کے کنوئیں میں پھینک دیا تھا ——— دہلی بھی غائب، مسلم بھی غائب، صرف ہوٹل باقی رہ گیا تھا۔

گوالیار ہوٹل" کے مالک نے رات ہی رات اپنا سائن بورڈ "ہندوستانی ہوٹل" کے نام سے پینٹ کرا لیا تھا۔

مگر سڑک پر سے گزرتے ہوئے دو سنگھی نوجوان کہہ رہے تھے۔
"اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہم تو خوب اچھی طرح جانتے ہیں اس ہوٹل کا نام ۔ گوالیار سے پناہ لینے آئے تھے سالے! ۔ اب کہاں بچ کر جائیں گے۔

مسجد اور محل

ہندوستانی فوج شہر میں داخل ہو چکی تھی اور اس کی آمد کی دہشت سے عائشہ اور فاطمہ کی اَن گنت بیٹیاں کنوؤں میں کود کر اور زہر کھا کر مر گئی تھیں اور جن کے لئے حمید خاں اپنی سولہ سالہ نوجوان لڑکی کی لاش لئے بیٹھا تھا۔
شاہ عثمان زندہ باد
شاہ عثمان زندہ تھا ـــــ مطلق العنان شاہی زندہ تھی ۔خون آشام جاگیرداری زندہ تھی۔ اور ہزاروں حیات خاں مر رہے تھے جنہوں نے مسجد کی حفاظت کے دھوکے میں ایک مصیبت آلودہ محل کے دروازوں میں اپنی لاشیں پاٹ دی تھیں۔
مگر مسجد بھی نہ بچ سکی البتہ محل بچ گیا۔
محل اور مسجد ایک دوسرے کے بہت پرانے رفیق ہیں۔ انہی پتھروں اور اسی چونے گارے اینٹ پتھر سے جس سے محل کی دیواریں کھڑی ہوتی ہیں ۔ اسی سے مسجد، مندر اور گرجا کے مینار بھی بلند ہوتے ہیں اور برسوں پرانی تاریخ سامنے کھلی پڑی ہے کہ مسجدوں کے مینار ہمیشہ سے محلسراؤں کی دیواروں کو محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کئے گئے ۔جس شاہجہاں نے لال قلعہ تعمیر کیا اسی شاہجہاں نے جامع مسجد بھی تعمیر کی، بادشاہ اور بادشاہ کا خدا دونوں ایک

دوسرے کے محافظ اور پشت پناہ رہے ہیں۔ مسجدوں کے مینار محل کے کنگوروں کی اسی لئے حفاظت کرتے ہیں کہ وہاں خدا کا سایہ رہتا ہے ـــــ وہاں حیات خاں نہیں رہتا ـــــ اسی لئے مسجد کے مینار اور محلسرا کے کنگوروں کو حیات خاں سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ حیات خاں نے اپنے جسم کا پسینہ اور اپنے پٹھوں کی قوت دے کر اس قدر پر شکوہ مسجد اور عالیشان محل تعمیر کیا مگر اس کے سر پر گھاس پھوس کی چھت تھی اور جب زلزلے میناروں اور کنگوروں کی طرف بڑھنے لگے تو حیات خاں اپنی جھونپڑی سے نکل کر اپنے بیوی بچوں کو بھول کر نعرہ لگاتا ہوا دوڑا۔

اللہ اکبر

شاہ عثمان زندہ باد

اللہ بڑا ہے۔ شاہ عثمان زندہ ہے۔ حیات خاں دلدل میں ساکت و صامت پڑا ہے اس کی بیوی ننگی کلائیاں، اجڑی مانگ لئے آنسو بھری آنکھوں سے گھر کے اس بند دروازے کو تک رہی ہے جس پر اب کوئی دستک نہیں ہوگی۔ جواب کبھی بھی نہ کھل سکے گا کیونکہ اللہ بڑا ہے اور شاہ عثمان زندہ ہے۔

قائد کے حکم پر حیات خاں نے جام شہادت پیا اور حسب روایتِ بزرگاں سیدھا جنت میں چلا گیا۔ مگر اپنی جوان بیوی اور دو ننھے ننھے بچوں کے لئے ایک دوزخ چھوڑ گیا۔ اُسے حیاتِ جاوداں ملی اور اس کی بیوی کو ایک مسلسل موت۔

ـــــ اے شہید آزادی ـــــ تیری باعظمت روح کو ہم سلام کرتے ہیں۔ تیرا نام وطن کی تاریخ میں اور تیری بیوی بچوں کا نام خیرات خانوں کے رجسٹروں میں آبِ زر سے لکھا

جائے گا۔ تاریخ صرف حیات خاں کو جانتی ہے۔ حیات خاں کی اس زندگی سے تاریخ کو کوئی دلچسپی نہیں جو بھوکی تھی۔ ننگی تھی۔ مقروض تھی۔ ذلیل تھی۔ بے عزت تھی۔

شہر میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ہندوستانی فوجیں "کیولری بینڈ" بجاتی شہر کی سڑکوں پر سے گزر رہی تھیں۔ مسلمانوں نے اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لئے تھے۔ روشنیاں بجھا دی تھیں۔ اور ان کے سامنے اب اندھیرا ہی اندھیرا تھا ــــ ہندوؤں نے گھر کی ایک ایک کھڑکی کھول دی تھی۔ طاقوں میں دیئے جلائے تھے۔ رضاکاروں کے ڈر سے جو دروازے نو مہینے سے بند تھے۔ اب پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ ہندو خوشی کے جے کار لگاتے باہر نکل آئے تھے۔ کیونکہ اب رضاکاروں کے پاپ کا گھڑا بھر چکا تھا اور ٹوٹ چکا تھا۔ مگر ابھی ایک مرحلہ باقی تھا۔

انتقام ــــ!

کل رضاکار غنڈوں نے ہندوؤں کو لوٹا تھا۔ آج ہندو غنڈے رضاکاروں کو لوٹ رہے تھے۔ کل رضاکاروں نے ہندو عورتوں کی عصمتیں لوٹی تھیں۔ آج ہندو مسلمان عورتوں کی آبرو لوٹ رہے تھے۔ کل تک ہندو سفر نہیں کر سکتے تھے۔ آج مسلمانوں کے لئے سفر کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ کل تک ہندو کے خون سے جاگیردار کے محل کے طاقوں میں چراغ جلائے جاتے تھے۔ آج مسلمانوں کا خون محل کے چراغوں میں بھرا جا رہا تھا۔

اور محل جوں کا توں منور تھا۔ جوں کا توں جگمگا رہا تھا۔

ہندوستانی فوج کے آتے ہی رضاکاروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ ویسے تو

ہر مسلمان رضاکار تھا مگر ۷ استمبر کی شام تک سارے رضاکاروں نے اپنی اپنی وردیاں جلادی تھیں لیکن ہندو کہہ رہے تھے۔

"ابھی سانپ مرا نہیں۔ صرف کینچلی اتار پھینکی ہے۔ اسے پکڑلو"

اور عبدالغفور پان سگرٹ مرچنٹ کو اس کی چھوٹی سی دوکان پر سے گرفتار کرکے بلارم کے فوجی جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ مگر ادھر رضاکاروں کے سالار اعلیٰ مسٹر بشیر احمد نے اورنیٹ پریس کی معرفت مقامی اخباروں میں ہندوستانی فوجی جمہوریت کا خیر مقدم کیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی پچھلی فسطائی اور اسلامی روش سے باز آئیں اور ہندوستانی فوجی جمہوریت کا پورا پورا ہاتھ بٹائیں۔

روزنامہ "جناح" کے ایڈیٹر مسٹر اظہر حسین رضوی نے جو کل تک قاسم رضوی اور مجلس اتحاد المسلمین اور رضاکارانہ تحریک کے بڑے پرجوش حامی اور مبلغ تھے۔ اپنے اخبار میں ایک وضاحتی بیان شائع کیا کہ قاسم رضوی اور اس کی مجلس اور رضاکارانہ تحریک فسطائیت کی بڑی بدترین شکلیں ہیں۔ انہوں نے حیدرآباد کو اور حیدرآبادی عوام کو تباہ کیا ہے۔ کل رضوی کے قصیدہ گو اظہر حسین صاحب نے آج اس راز کا انکشاف کیا کہ جب انہوں نے حیدرآباد میں اخبار جاری کرنے کا خیال ظاہر کیا تو لایق علی حکومت نے سوائے "جناح" کے اور کسی نام سے اخبار نکالنے کی اجازت نہیں دی تھی —— حالانکہ ہوم سکریٹری ڈپارٹمنٹ میں ان کی واحد درخواست ڈیکلریشن برائے اخبار بنام "جناح" فائیل میں ابھی تک محفوظ تھی۔

ادھر رضاکاروں کے بڑے بڑے لیڈر اور زہریلے فرقہ پرست اخبار نویس

امن اور جمہوریت کی اپیلیں شائع کر رہے تھے۔ اور ادھر غریب مسلمان رضاکار، تانگے والے، ٹیکسی ڈرائیور، خوانچے والے، ہوٹلوں کے بیرے، دفتروں کے چپراسی، تیسرے دوسرے درجے کے کلرک، درزی، حجام، فوٹوگرافر، گھر ملو نوکر، سکولوں اور کالجوں کے طالب علم بلا رحم جیل میں جوتے کھاتے، مار سہتے، چکی پیس رہے تھے۔ نئے ملٹری کوارٹرز کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے۔

ہندوستان میں فوجی جمہوریت کے قیام کو تین دن گزر گئے تھے۔ لیکن لوگوں کو بڑی حیرت تھی کہ ابھی تک مجاہدِ اعظم کو کیوں گرفتار نہ کیا جا سکا ـــــــ حالانکہ مجاہدِ اعظم دارالسلام کے برآمدے میں بیٹھے رات اور دن بس لکھتے ہی لکھتے جا رہے تھے اور سگریٹیں ہی سگریٹیں پھونک رہے تھے۔ ہزاروں مسلمان انہیں دیکھنے ان کے گرد جمع ہوتے تھے مگر قاسم رضوی صاحب لکھنے میں اتنے محو ہوتے تھے کہ انہوں نے گردن اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہ دیکھا۔ وہ کیا لکھ رہے تھے کسی کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ صرف قیاس تھا کہ وہ اپنے اور نظام کے تعلقات اور نظام کی سازش کی مکمل روئیداد لکھ رہے ہیں۔ ایک بار لوگوں نے انہیں بہت مجبور کیا کہ آپ ہم سے بھی کچھ بات کریں ـــــ رضوی صاحب نے اپنا پُر اطمینان چہرہ اوپر اٹھایا اور پوچھا:

فرمایئے آپ لوگ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

لوگوں نے پوچھا:

ہم نے سنا ہے کہ آپ خودکشی کرنے والے ہیں۔

رضوی صاحب نے جواب دیا: نعوذ باللہ!

اور وہ پھر لکھنے میں مشغول ہو گئے۔

رضوی صاحب ان تین دنوں کے دوران میں رضاکار وردی میں ملبوس اور مسلح تھے وہ صرف نماز پڑھنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھتے تھے اور نماز کے بعد پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتے تھے۔

دوسرے دن صبح معلوم ہوا کہ رضوی صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی گرفتاری کے بارے میں بڑی "فنٹاسٹک کہانیاں" مشہور ہو گئیں۔ میں تو گھر میں چھپا ہوا تھا۔ البتہ میرے بھائیوں سے وہ کہانیاں معلوم ہوتی تھیں۔

ایک کہانی تو یہ ہے کہ:

رات کے چار بجے ہندوستانی اور ریاستی فوج اور پولیس کے عہدہ دار رضوی صاحب کے پاس گئے۔ رضوی صاحب سے بصد منت سماجت گرفتار ہو جانے کی درخواست کی۔ رضوی صاحب پستول سے مسلح کھڑے ہو گئے اور ان سے کہا کہ:

آپ لوگ میرے ساتھ چائے پیجئے۔ پھر میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔

چائے پینے کے بعد رضوی صاحب دارالسلام سے باہر نکلے۔ دارالسلام رات اور سویرے کے ملے جلے اندھیرے اجالے میں انہوں نے دارالسلام کی عمارت کو فوجی انداز میں سلام کیا اور اس وقت تک دارالسلام کو دیکھتے رہے جب تک ان کی آنکھوں میں آنسو نہ بھر آئے اس کے بعد ہندوستانی فوج کے ایک افسر نے ان سے ان کا پستول مانگا تو رضوی صاحب نے کہا:

"لیجئے آخری رضاکار کا آخری پستول"

اس کے بعد یہ بھی سنا گیا کہ میجر جنرل جے۔ این چودھری فوجی گورنر حیدر آباد نے پورے فوجی اعزاز و مرتبہ سے ان کا استقبال کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ طنز بھی کیا کہ:

"میں تو آپ کو جنگ کے میدانوں میں دیکھتا رہا۔ مجھے آپ کو وہیں دیکھنے کی تمنا تھی مگر آپ تو وہاں سولہ سولہ سترہ سترہ سال کے نوجوان لڑکوں کو بھیجتے رہے۔

کم از کم آخری دن تو آپ کو مجھے جنگ کے میدان ہی میں ملنا چاہئے تھا۔"

یہ اور اس قسم کی بہت سی کہانیاں مشہور ہو رہی تھیں۔

اس کے بعد پھر یہ مشہور ہوا کہ رضوی صاحب کو "لال قلعہ" بھیج دیا گیا تاکہ وہ لال قلعہ پر جھنڈا لہرائیں ـــــ آصفیہ یا سبز ہلال پرچم نہیں ـــ بلکہ ترنگا جھنڈا

کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ سناتا۔ مگر سرکاری خبر یہ ملی کہ مجاہدِ اعظم بلا رم فوجی جیل کے ایک مخصوص قید خانے میں ہیں۔ قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں۔ دن بھر چائے اور "کریون اے" کی بیشمار سگریٹیں پیتے رہتے ہیں اور انگریزوں کے اس "یار وفادار" کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں جس نے امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین ہونے کے باوجود ہمیشہ مومنین اور مسلمین کو دھوکہ دیا۔ جس نے آج بھی مذہب کا فریب دے کر ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جس نے ایک ایک چاندی کے سکے کے عوض ایک ایک "حیات خاں" کو موت کے تاجر کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔

چند باغی نوجوان اس "ازلی یار وفادار" موت کے اس پرانے تاجر سے ہزاروں "حیات خانوں" کی سانسیں وصول کرنے کا عزم لے کے اٹھے مگر ہتیار ـــــ؟

ہتھیار نہیں تھے۔ ہندوستان کی فوجی جمہوریت نے حکم نافذ کر دیا تھا کہ رضاکار تین دن کے اندر اندر سارے لائسنس یافتہ اور غیر لائسنس یافتہ ہتھیار فوجی کوارٹر زفتح میدان یا قریب کے کسی تھانے میں داخل کر دیں۔

میرے ایک دوست قدیر کے پاس ایک غیر لائسنس یافتہ اسٹین گن تھی۔ مگر وہ واپس کرنے سے گھبرا رہا تھا کہ کہیں اس بہانے گرفتار نہ کر لیا جائے۔ وہ آدھی رات تک سوچتا رہا۔ اور آدھی رات کو چپکے سے اس نے اپنی اسٹین گن ایک ہمسائے کے صحن میں پھینک دی۔ اس کے ہمسائے نے جب اپنے صحن میں ایک اسٹین گن دیکھی تو بڑا گھبرایا۔ اور چپکے سے وہی گن پھر قدیر کے صحن میں پھینک دی۔ قدیر نے اب کی بار وہ گن دوسرے ہمسائے کے گھر میں پھینکی۔ مگر دوسرے ہمسائے نے پوری دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ جس کا مال اسی کو لوٹا کر پورا پورا حق ہمسائیگی ادا کر دیا۔۔۔۔ قدیر جھلا اٹھا اور اور اس نے پڑوسی کے نوکر کو اس کی غربت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر پانچ روپے انعام اور اسٹین گن پکڑا دی کہ وہ اسے قریب کے تھانے میں اپنے نام سے جمع کرا آئے۔

مگر اس نوکر نے وہ گن تھانے میں پہنچانے کے بجائے ظہیر باغ کے کنوئیں میں پھینک دی۔

دوسرے دن ہندوستانی سپاہی شہر کے سارے کنوئیں جھانکتے پھرتے رہے حتیٰ کہ قبریں تک کھود ڈالیں کہ رضاکار کہیں شمشیر بکف تو دفن نہیں ہوئے ـــــ !!

عصمت کا کیا نام ہے

اس شام میرا پڑوسی حمید خاں زار وقطار روتا ہوا میرے پاس آیا کہ اس کی نورِ نظر جمیلہ کی لاش "کچّی قبر" سے نکل کر باہر آ پڑی ہے .... بیچاری ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے رو رو کر گڑگڑا کر التجا کی تھی کہ وہ ابھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ مگر سولھویں برس کی بھرپور جوانی زندگی نہیں ہے بلکہ عصمت اور آبرو کا نام زندگی ہے۔ اسی لئے وہ بادلِ ناخواستہ زبردستی مر گئی تھی ـــــ اور اب پھر اسی دنیا کی سطح پر آ گئی تھی۔

لیکن وہ اسٹین گن نہیں تھی ـــــ لڑکی تھی۔ یا پھر وہ لڑکی نہیں تھی مذہب کی لاش تھی۔

حمید خاں کو وہم تھا کہ اس کی لڑکی جمیلہ عصمت مآب تھی اور عصمت مآب ہی مری۔ مگر بیچاری لڑکی تو پہلے کئی بار اپنی عصمت لٹا چکی تھی۔ وہ جب جمیلہ نہیں رادھا تھی تو رضا کاروں نے کئی بار اس کی آبرو لوٹی تھی۔ وہ جب امرت کور تھی تو رضا کاروں نے ناندیڑ کے کسی ویران مندر میں اسے کئی بار ننگا کیا تھا۔ اور اب وہ جمیلہ بن کر مری ـــــ حمید خاں ہر کسی سے جمیلہ کی موت کا ذکر بڑے فخر سے کرتا ہے کہ وہ خوش ہے کہ جمیلہ محفوظ عصمت لئے اس دنیا سے اٹھ گئی ـــــ اب حمید خاں کو کوئی کس طرح سمجھائے کہ لڑکی کا نام جمیلہ ہو سکتا ہے۔ مگر لڑکی کی عصمت کا کیا نام رکھا جا سکتا ہے ـــــ ؟

جمیلہ تو تاریخ کے پہلے صفحے ہی سے لٹتی چلی آئی ہے۔ جمیلہ صدیوں سے پہلے بغداد اور مصر کے بازاروں میں فروخت ہو چکی ہے۔ "زاروں" کے محلوں میں ننگا رقص کر چکی ہے۔ فرانس اور انگلستان کی عیش گاہوں میں بے عزت ہو چکی ہے۔ نازی جرمنوں نے سارے براعظم یورپ میں اسے بے آبرو کیا ہے۔ بنگال کے دولت مندوں نے ٹکے ٹکے کے عوض اس کا گوہر عصمت خریدا ہے اور پھر دہلی اور لاہور میں ماونٹ بیٹن پلان نے اس کی عصمت بھی تقسیم کر دی۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ حمید خاں کی بیٹی کا نام جمیلہ ہے۔ مگر عصمت کا کیا نام ہے؟ عصمت کا تو کوئی نام نہیں ہوتا۔ عصمت کا تو کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ عصمت کا تو کوئی وطن نہیں ہوتا ——!!

حمید خاں کو جمیلہ کی شاندار موت پر بڑا افسوس ہے مگر حمید خاں خود اپنے بارے میں یہ کیوں نہیں سوچتا کہ وہ خود بھی زندہ ہے یا نہیں ہے —— ؟ حمید خاں جس نے پاس وضع داری کی خاطر زندگی بھر شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنی آج اس نے اسٹین گن اور تلوار کے ساتھ ساتھ اپنی شیروانی اور ترکی ٹوپی بھی کنوئیں میں پھینک دی اور اپنی ایک بالشت داڑھی بھی منڈوا دی تاکہ پہچانا نہ جا سکے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان آج وہ گاندھی ٹوپی، کھدر کے کرتے، اور نہرو جیکٹ میں ملبوس ہے۔ اس سے جو کوئی بھی ملتا ہے بڑی دیر تک اسے پہچان ہی نہیں سکتا کہ وہ حمید خان ہے۔ جو پہچان لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حمید خاں ہندو ہو گیا ہے۔ مذہب تو صرف اس کا لباس ہے۔ اور مذہب لباس کے سوائے کچھ بھی نہیں —— فرقہ وارانہ فساد اسلام اور

ہندو مت کا فساد نہیں، قرآن اور وید کی تعلیمات کا اختلاف نہیں۔ بلکہ صرف دھوتی اور پاجامے، ترکی اور گاندھی ٹوپی کا جھگڑا ہے ــــ محمدؐ عربی اور کرشن مراری کا سکھایا ہوا مذہب جان بل کے سکھائے ہوئے مذہب سے بالکل مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو سارے برِاعظم ہند میں ہندو از سرِ نو ہندو اور مسلمان از سرِ نو مسلمان ہوا۔

اور اس کے بعد ہندو نے مسلمان سے کہا:

"آج عابد روڈ پر ترکی ٹوپی نظر نہیں آتی"

مسلمان نے جواب دیا:

"کل عابد روڈ پر گاندھی ٹوپی نظر نہیں آتی تھی۔"

جیسے مسلمان، مسلمان نہیں ترکی ٹوپی ہے اور ہندو، ہندو نہیں صرف گاندھی ٹوپی ہے۔

اگر مذہب ٹوپی نہ ہوتا صرف مذہب ہوتا۔

اگر مذہب ہندو مت، اسلام، عیسائیت اور یہودیت کا نام نہ ہوتا صرف انسانیت کا نام ہوتا تو ــــــ ؟؟

بھیانک اندھیرے میں

میں نے اخبار "پیام" اٹھایا۔ کسی نام نہاد ترقی پسند ادیب نے فوجی جمہوریت کا استقبال کرتے ہوئے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ ابراہیم جلیس اینڈ کو

کو گرفتار کر لیا جائے۔ میرے دو بہرے کمینے دشمن امجد یوسف زئی، غوث محی الدین، اظہر خورشید اور اسد اللہ جو ایلا اہرن برگ، لوئی اراگان، کرشن چندر اور جوش ملیح آبادی سے زیادہ قابل اور زیادہ مشہور ترقی پسند ادیب ہیں چھچھورے اخبارات "رہبر وطن" اور "اپنا دیس" میں فوجی گورنر کو اور غنڈوں کو میرے بارے میں مطلع کرتے رہے۔ غوث محی الدین جو عابد روڈ کا ایک کباڑیا کتب فروش ہے۔ اظہر خورشید اور امجد یوسف زئی جو میری شہرت اور عظمت سے جلتے تھے۔ محمد اسد اللہ جو سٹی ہائی سکول کا ایک نرم و نازک لونڈا ہے جو کل تک میرے آگے گڑگڑایا کرتا تھا — ان سب کو ایک اچھا موقعہ ہاتھ آیا کہ کم از کم ابراہیم جلیس کی مخالفت کے طفیل میں ان کے نام مشہور ہو جائیں گے۔ اور لوگ انہیں جاننے لگیں گے۔

ان لوگوں نے میرے ایک محترم دوست عادل رشید ایڈیٹر "شاہد" ہفتہ وار بمبئی کو گانٹھ لیا اور "شاہد" کی وساطت سے مجھ پر اور میرے سارے خاندان پر غیر مہذبانہ، غیر شریفانہ حملے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ میرے ساتھ حیدرآباد کے ایک شریف خاندان کی شریف کنواری لڑکی عزیز النساء کو خواہ مخواہ بدنام کرنا شروع کیا۔

انہی دنوں مجھے ایک اطلاع ملی کہ غوث محی الدین نے چند غنڈوں کو کثیر رقم دی تھی کہ وہ مجھے قتل کر دیں — مجھے اپنے ان کمینہ دشمنوں سے بڑی ہمدردی ہے کہ ان کی یہ دلی تمنا پوری نہ ہو سکی۔

اس کے برعکس میرے چند "شریف دشمن" بھی تھے۔ اختر حسن ایڈیٹر "پیام"،

سید عالم خوندمیری، سری نواس لاہوٹی، لطیف ساجد، کنول پرشاد کنول اور چندر سین جائیسوال جو وقتاً فوقتاً میری دلجوئی کرتے تھے۔ مجھے ڈھارس دیتے تھے۔ میری ہر ممکن مدد کا وعدہ کرتے تھے ــــــ جو اتنے بااثر تھے کہ چاہتے تو مجھ سے بڑا سخت بدلہ لے سکتے تھے لیکن وہ صحیح معنوں میں "ترقی پسند" تھے اور انہوں نے میرے ساتھ میری مصیبت میں بھی ترقی پسندانہ سلوک کیا۔ جسے میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

میں بھیانک اندھیرے میں ملفوف تھا۔ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا کہ کدھر جاؤں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔

اندھیرا ــــــ اور اندھیرا!

ریڈیو اسٹیشن سے ایک دوست آئے اور انہوں نے بتایا کہ ہندوستانی فوج کے چار سکھ افسر آئے تھے انہوں نے وہاں پوچھا:

"وہ ابراہیم جلیس کہاں ہے جو ہماری چتا بنانے والا تھا"

ایک دوست نے گپ ہانک دی۔

"وہ پاکستان بھاگ گیا"

یہ جواب سن کر ایک سکھ افسر نے کہا:

"اچھا ــــ کوئی بات نہیں۔ چار مہینے میں ہم پاکستان کا بھی "واک اوور" کرلیں گے۔ پھر کہاں جائے گا وہ ــــ!"

جو بھی مجھ سے ملنے آتا میری آنکھوں کے سامنے میری موت یا جیل خانہ تعمیر

کر کے چلا جاتا اور میں بھی اندھیرے میں جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کہ موت کس طرف سے آنے والی ہے۔

سرخ ستارہ

کوئی دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

میں بستر سے اٹھا مگر فاطمہ نے میری بانہہ پکڑ لی۔

"نہیں نہیں دروازہ مت کھولو۔ کیا جانے کون ہے۔؟ کہیں کوئی غنڈا ہو یا پولیس ہو۔!!"

دروازے کی کھٹکھٹاہٹ کے ساتھ آواز بھی آئی۔

"جلیس۔ جلیس۔ دروازہ کھولو۔ میں راج کپور ہوں۔"

راج کپور ——— میرا کمیونسٹ ساتھی۔ جس سے میں ایک سال پہلے بچھڑ گیا تھا۔ میں دروازے کی طرف جانے لگا مگر فاطمہ نے میرا راستہ روک لیا اور گھبرا کر کہنے لگی:

"نہیں باہر مت جاؤ۔ ہندو ہے۔ ان کافروں کا کیا بھروسہ الکفار ولا اعتبار"۔

مگر مجھے راج کپور پر پورا اعتماد تھا۔ وہ پورے ایک سال بعد آج آیا تھا۔ اتنی رات گئے۔ ممکن ہے وہ کسی لمبے سفر سے آرہا ہو۔ میں نے زبردستی فاطمہ کو اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ اور باہر کا دروازہ کھول دیا۔ راج کپور مجھے دیکھتے ہی گلے سے

لیٹ گیا اور ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

راج کپور کو اتنے عرصے بعد یوں اچانک اپنے قریب دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اور میں شرمسار بھی تھا۔ اس لئے ہر لمحہ کچھ پوچھنے کا ارادہ کر کے بھی میں کچھ نہ پوچھ سکا۔ راج میری اس خموشی اور تذبذب کو پہچان گیا اور بولا:

"کیوں بھئی میرا آنا ناگوار تو نہیں گزرا تمہیں"

میں نے کہا:

"نہیں قطعاً نہیں۔ تم اتنے دن کہاں تھے۔ تم سے جدا ہوئے ایک سال گزر گیا غالباً۔"

راج نے کہا:

"میں تو کہیں نہیں گیا تھا۔ یہیں تلنگانہ کے کھیتوں میں مخدوم محی الدین کے ساتھ جہاں اب تین ہزار گاؤں جاگیردارانہ نحوست کے پنجے سے آزاد ہو کر سرخ جھنڈے کی چھاؤں میں آباد ہیں۔ ۳۰ لاکھ انسانوں نے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے اس جہنم زار میں دس ہزار مربع میل کی ایک "انسانی جنت" بنائی ہے۔ جہاں صرف "انسان" رہتا ہے۔ جو آج ساری ارض ہمالہ کو آداب زندگی سکھا رہا ہے"

میں نے پوچھا:

تم مجھ سے ملے کیوں نہیں؟

راج نے جواب دیا۔

میں بھلا تم سے کیسے مل سکتا تھا۔ تم رضاکارانہ تحریک کے اتنے بڑے لیڈر ——

اتنے بڑے ادیب ـــــ خالد وٹیبو کی اولاد ـــــ میں بیچارا ایک مزدور قسم کا آدمی۔ مجھے تم سے ڈر لگتا تھا۔

میں نے پوچھا:

بدلہ لینے آئے ہو۔ ؟

راج نے ذرا کرخت لہجے میں جواب دیا:

"ہاں ـــــ اور اس وقت میری جیب میں پستول بھی ہے۔"

میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے راج کو دیکھنے لگا۔ جو ابھی کہ ابھی میرے جیتے جاگتے جسم میں موت بھر دیگا۔ راج نے تھوڑی دیر تک مجھے غور سے دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

کیوں مجاہد اعظم ـــــ؟ ڈر گئے؟؟ ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کے جسموں میں فرقہ واریت کا زہر بھر کر انہیں جام شہادت پلا کر اب خود جام شہادت نہ پیو گے ـــــ؟ تمہیں شرم آنی چاہئے میرے دوست ـــــ ریڈیو اسٹیشن کے محفوظ مائیکروفون کے پیچھے سے جاہل سادہ لوح انسانوں کو بڑھاوے دینا، انہیں موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کا جوش دلانا، انہیں شہیدوں کی جنت کا لالچ دینا بڑی آسان بات ہے۔ مگر اب جبکہ تمہارے سامنے راج کبیر پستول لئے بیٹھا ہے۔ تمہاری وہ جوشیلی زہریلی تقریریں کیا ہوئیں۔ تم نے جاگ دار کے اسلام" کے تحفظ کی خاطر سوگند اٹھائی تھی کہ آخری قطرۂ خون بھی بہا دو گے۔ میں تمہارا آخری تو نہیں البتہ پہلا قطرۂ خون لینے آیا ہوں۔"

میرے جسم کا لہو خشک ہو گیا تھا۔ اور راج بار بار اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالتا اور نکالتا رہا۔ میں اسے ایسی خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ راج کپور نہیں موت ہے

بالآخر اس نے جیب سے پستول نکال ہی لیا۔

وہ پستول نہیں تھا۔ سگرٹ کا پیکٹ تھا۔ اس نے ایک سگرٹ جلا کر ڈبیا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"اگر سگرٹ میں زہر ہوتا تو میں خود نہ پیتا۔ اس لئے تم بھی پی سکتے ہو۔"

اب میری جان میں جان آئی۔ اور میں نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے ایک سگرٹ جلائی۔ راج کہنے لگا:

جلیس مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ تم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ کاش تم نے رضا کارانہ تحریک کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ مگر روپیہ، شراب اور عورت نے تمہارا دماغ الٹ دیا تھا —— خیر۔ میں یہاں لکچر دینے نہیں آیا۔ میرے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ میں صرف اس لئے تمہارے پاس آیا تھا کہ آج تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے ویسے میں خود تم سے زیادہ خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ کل تک "نظام" کی نوکر شاہی میری دشمن تھی۔ آج سے ہندوستان کی "سرمایہ دار جمہوریت" میری تلاش میں ہے مگر میں خطرات میں پلا اور بڑھا۔ اب خطرات میری زندگی کا لازمہ ہیں۔ ...... ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں لوگ اب تمہاری زندگی کی تلاش میں ہیں۔ تم کو کل ہی حیدر آباد چھوڑ دینا چاہئے۔ کیا معلوم کہ کل ہی تم اس دنیا میں نہ رہ سکو۔ اس لئے کل فلاں وقت فلاں جگہ

تم مجھ سے ملو ـــــ اور میں تمہیں کچھ دن کے لئے غائب کر دوں گا۔ گھبراؤ نہیں، بہت جلد پھر تم یہاں آ جاؤ گے۔ میرے دوست اب تلنگانہ پھیل رہا ہے۔ وسیع ہو رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب تلنگانہ ساری ارض ہمالہ کو اپنی آغوش میں اٹھالے گا۔ اس وقت تم پھر اپنے گھر آ جاؤ گے ـــــ اچھا توکل .... بائی بائی

راج کپور چلا گیا۔ راج کپور جو اندھیرے میں نور کی کرن بن کر آیا تھا۔ سرخ ستارہ بن کر چمکا تھا۔ میرے دل کے اندھیرے طاق میں بھی امید اور زندگی کی ایک شمع جلا گیا۔

میں بڑی دیر تک راج کپور کے ایک ایک جملے کو دھراتا رہا۔ اور مجھے ایک بہت بڑی شکست اور ایک بہت بڑی ندامت نے اتنا بے چین کر دیا تھا کہ رات بھر میں سو نہ سکا۔ ہر لمحہ مجھے یہ احساس تنگ کرتا رہا کہ میں نے انسان سے غداری کی ہے میں نے مذہب کے نام پر انسانیت کی توہین کی ہے۔ مذہب ـــــ! مذہب سے آخر میرا کیا رشتہ تھا۔ پچھلے تیرہ سال سے میں نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی۔ سورۂ فاتحہ اور "قل اللہ ہو احد" کے سوائے مجھے ایک سورہ بھی یاد نہیں۔

ندامت سے میرا سر جھکا ہوا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ٹیپو کا قاتل ہوں۔ اسلام کا قاتل ہوں۔ انسانیت کا قاتل ہوں، اپنے گھر کا آپ لٹیرا ہوں۔ میں نے اپنے بھائیوں کے جسموں سے ان کی زندگیاں چھین لی ہیں۔ میں نے چار ہزار سالہ تہذیب کو تار تار کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی تاریخ کے زریں صفحات پھاڑ ڈالے ہیں۔

اور آج میں چھپنے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ موت کے بازار میں زندگی کی بھیک

مانگ رہا ہوں مگر کہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ کہیں کوئی سایۂ حیات نہیں ہے کہیں کوئی آغوشِ محبت وا نہیں ہے۔

بالکل یکہ و تنہا ہوں۔ میرے ترقی پسند ساتھیوں کا قافلہ دور، بہت دور نکل گیا ہے۔ ان کے قدموں کی اڑائی ہوئی گرد تک مجھے نظر نہیں آتی۔ ایک ایک کا نام لے کر پکارتا ہوں۔ مگر مہیب سناٹے اور گھناؤنے اندھیرے میں میری آواز مجھ ہی تک لوٹ آتی ہے۔

کسی کرشن چندر کا جواب نہیں آتا۔

کوئی احمد ندیم قاسمی نہیں بولتا۔

خوش رہو اہلِ وطن

میں تھک کر بیٹھ گیا۔

مگر میرا ایک دوست جو خفیہ پولیس کا انسپکٹر ہے میرے قریب آیا اور بولا:

"یہ بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ۔ کسی طرح فوراً بھاگ جاؤ۔ ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔ ساڑھے نو بجے تک پولیس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ لئے گھر پہنچ رہی ہے۔"

میرا ضعیف باپ، میرے بھائی اور میری بیوی سب کہہ رہے ہیں:

"ہاں ہاں ـــــ بھاگ جاؤ۔ ورنہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑیں گے۔ تم کہیں ہو مگر زندہ رہو۔ یہی ہماری تمنا ہے۔ یہی ہماری دعا ہے۔"

مگر میں زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میں کتنی زندگیوں کا قاتل ہوں۔ نہیں میں کہیں نہیں بھاگوں گا۔

میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ٹپ

ٹپ

تمہیں جینا پڑے گا

تمہیں جینا پڑے گا

میرے ارد گرد میرے معصوم بچے مچل رہے تھے۔

"ہم بھی پاکستان جائیں گے۔ ہم بھی پاکستان جائیں گے۔"

میری چھوٹی لڑکی لی لی کہہ رہی تھی۔

"بابا ——— تانگہ منگواؤ۔ میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان چلوں گی۔"

بھولی بچی ——— پاکستان کو تانگہ نہیں جاتا۔ پاکستان کو صرف ہوائی جہاز جاتا ہے۔ پاکستان کو صرف مال دار مسلمان جا سکتے ہیں۔ تانگہ میں بیٹھنے والے مسلمانوں کے لئے پاکستان اتنی ہی دور ہے جتنی آسمانوں والی جنت ....

لیکن کیا اتنی وسیع و عریض زمین پر زندہ رہنے کے لئے پاکستان کے سوائے اور کوئی خطۂ زمین ہے ہی نہیں ———؟

ہاں مسلمان صرف پاکستان میں اور ہندو صرف ہندوستان میں زندہ رہ سکتا ہے۔ جکمران سامراج اور سرمایہ دارانہ قیادت نے پنجاب کی سرزمین پر اسی لئے ایک

چھٹا دریا کھود دیا ہے۔ خون کے دریا کے دونوں طرف۔

ہندوستان زندہ باد

پاکستان زندہ باد

مگر ساڑھے چار کروڑ ابراہیم جلبیسوں کا نعرہ کیا ہے۔؟ ان کا وطن کہاں ہے؟ ان کی زندگی کدھر ہے؟

یہ سوچنے کا وقت نہیں۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔

بھاگو

بھاگو

میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے مجھے ایک سو روپیہ دیا تھا اور میرے برادر نسبتی عبدالرحمن صاحب نے دو سو روپے دیئے تھے —— زندگی کی ایک موہوم سی امید لے کر میں نظر حیدر آبادی، خواجہ معین الدین، احمد عبدالقیوم، مصطفیٰ محمود عبدالماجد اور طاہر عبدالباسط اندھیرے میں نکل پڑے۔

اپنے ضعیف باپ سے دور جو مجھے اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھتا تھا۔ اپنے بھائیوں سے دور جن کے ساتھ میں نے زندگی کے پچیس سال گزارے تھے۔ اپنی حاملہ بیوی سے دور جو سات مہینے بعد میرا ایک اور جسم جنم دے گی اور جسے شاید اب میں دیکھ بھی نہ سکوں۔ اپنے ننھے ننھے معصوم بچوں سے دور جنہیں پاکستان کی سیر کرانے کے لئے میں تانگہ نہ لا سکا۔

میں بھاگ رہا تھا۔ ہندوستان سے اسلام بھاگ رہا تھا اور جامع مسجد کے مینار

جھک جھک کر مجھ سے پوچھ رہے تھے:

بتاؤ ــــ تم نے ہمیں کیوں سر بلند کیا تھا؟

تاج محل کے خوب صورت مقبرے میں ممتاز محل کی بے قرار روح پوچھ رہی تھی۔

بولو ــــ مجھے کس شاہجہاں کے سپرد کئے جا رہے ہو؟

رضا کاروں کی تیس ہزار لاشیں میرے قدموں تلے چیخ رہی تھیں۔

مملکت اسلامیہ حیدر آباد کے ہم آزاد باشندوں کو آزادی بخش کر اب تم کہاں بھاگے جا رہے ہو۔

ٹھہرو۔

ٹھہرو۔

مگر میں بھاگتا رہا۔ تیس ہزار رضا کاروں کی لاشیں لانگتا پھلانگتا جنہیں اسلام کے نام پر اپنی زندگی لٹانے کے لئے میں بہکاتا رہا۔ اور اب میں بھاگ رہا تھا۔ کیونکہ حیدر آباد میں پٹیل ڈیموکریسی، برلا ڈیموکریسی اور چودھری ڈیموکریسی داخل ہو چکی تھی۔

بمبئی ــــ!

بمبئی پہنچنے کی بڑی خوشی تھی۔ مگر دل میں ڈر ابھی پوری طرح سمایا ہوا تھا۔ صرف مس نگار سلطانہ (مشہور فلم سٹار) کے گھر ہم اطمینان کی سانس لیتے تھے ورنہ سڑکوں پر ہر طرف ہر آدمی ہمیں خفیہ پولیس کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بمبئی کے مسلمان حیدر آبادی مسلمانوں کو اپنے گھر پناہ دیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ہم میں سے بھی کوئی حیدر آباد کا نام تک زبان پر نہ لاتا تھا۔ باہر سڑکوں پر میں بالعموم پنجابی میں باتیں کرتا تھا۔

ایک بار میں فورٹ سے ماہم نگار سلطانہ کے گھر لوٹ رہا تھا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کسی سٹاپ پر ایک خوب صورت سا آدمی چڑھا اور میں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا۔ مگر اس خوب صورت آدمی نے مجھے پہچان لیا اور پکارا:

ہیلو رضا کار ــــ تم حیدر آباد سے کب آئے ؟؟

بس کے سارے لوگ مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے میں "بھوت" ہوں۔ میں بہت گھبرا گیا تھا۔ مگر بڑی حاضر دماغی کے ساتھ مسکراتے ہوئے میں نے کہا:

ہیلو۔ پریم دھون۔ یار میں تمہارے ہی گھر جا رہا تھا۔ اور جیسے ہی اگلا سٹاپ آیا۔ میں نے پریم دھون کو زبردستی ساتھ اتار لیا پھر ایک ریستوران میں جا کر ہم بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ پریم دھون نے اپنی محبوبہ نور جہاں سے شادی کر لی ہے اور آج کل وہ بمبئی ٹاکیز میں میوزک اور ڈانس ڈائریکٹر ہے۔ "ضدی" اور دوسری کئی فلموں کے گانے لکھ چکا ہے۔ میوزک دے چکا ہے بس عیش کر رہا ہے پٹھا۔

خلاف توقع پریم دھون مجھ سے بڑے پریم سے ملا۔ وہ مجھ سے پہلے کی طرح پیار اور محبت سے باتیں کر رہا تھا جیسے میرے رضا کار ہونے سے وہ ناراض نہیں تھا۔ اس نے کہا:

"زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ آدمی کبھی کبھی بڑا" ڈس الیوژن" ہو جاتا ہے بڑے بڑے لیڈر فرقہ پرستی کی قالین پر قلابازیاں کھا چکے ہیں تو تم ــــ تم تو ایک نو عمر لڑکے ہو۔"

پریم دھون نے دوسرے دن بمبئی ٹاکیز آنے اور بھابی ــــ نورجہاں سے ملنے کی دعوت دی لیکن دوسرے دن میں اس سے نہ مل سکا۔ اس نے دعوت کا اہتمام کیا تھا اور بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میاں بیوی نے میرے انتظار میں دوپہر کا کھانا شام تک نہیں کھایا۔

اس سے رخصت ہو کر جب نگار سلطانہ کے گھر پہنچا تو وہاں "کیرم" کا کوئی شرطیہ مقابلہ ہو رہا تھا۔ نگار کے بھائی راشد اور بہنوئی اثر مجیدی ایک پارٹی تھے اور نظر حیدرآبادی اور ــــ مجروح سلطان پوری۔

میں مجروح سے لپٹ گیا۔ اس کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ مجروح نے بتایا کہ کرشن چندر، مہندر ناتھ، ساحر لدھیانوی وغیرہ سب الٰہ آباد کی کانفرنس میں گئے ہوئے ہیں۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن مجروح نظر سے اور مجھ سے بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ:

تم گیا وقت نہیں ہو کہ پھر آ بھی نہ سکو۔

وہ ہمیں یہیں بمبئی میں رہ جانے پر مجبور کر رہے تھے ــــ مجروح کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ کیفی اعظمی صاحب نے یہ خبر مشہور کر رکھی ہے کہ نظر حیدرآبادی اور ابراہیم جلیس پچانوے ہزار روپیہ لے کر حیدرآباد سے چلے تھے مگر روپیوں کی تقسیم کے ضمن میں دونوں میں سخت جھگڑا ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت میری جیب میں صرف بیس روپے باقی رہ گئے تھے۔

نظر تو وہاں رہنے کے لئے تیار ہو گئے مگر میرا دل نہیں مانتا تھا اور میں صابو صدیق سرائے کے چکر کاٹا کرتا تھا جہاں پاکستان کا ہائی کمشنر رہتا ہے۔ جہاں پاکستان جانے والے مسلمانوں کو پرمٹ ملتا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ مگر پاکستان پاکستانی مسلمانوں کی اسلامی مملکت ہے۔ اس لئے ہندوستانی مسلمان بغیر پرمٹ کے اور بغیر اجازت نامے کے پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہندوستانی مسلمان مسلمان تو ہیں مگر پاکستانی نہیں ہیں اور پاکستان ایک خالص اسلامی حکومت ہے۔

مجھے بھی ایک پرمٹ چاہئے تھا۔ پرمٹ آفس صابو صدیق کی سرائے میں ہندوستانی مسلمانوں کا ہجوم ہے مگر پاکستانی ہائی کمشنر تاج محل ہوٹل کے ایک عالیشان کمرے میں رہتا ہے۔ روزانہ پچاس پرمٹ جاری کرتا ہے اور بمبئی کے ہوٹلوں، چالیوں، سراؤں اور بھٹیار خانوں میں سات ہزار ہندوستانی مسلمان دو دو تین تین مہینوں سے پڑے ہیں۔ ان کی جیبیں خالی ہو گئی ہیں۔ وہ بھوکے مر رہے ہیں۔ بعض تو پاکستان کے عشق کو دل میں ہمیشہ کے لئے دفن کر کے واپس ہو رہے ہیں۔ جن کے دل میں پاکستان کا عشق بڑا صادق ہے وہ آدھی آدھی رات سے بھوکے پیاسے پرمٹ آفس کی کھڑکی کے ساتھ قطار باندھے کھڑے ہیں۔

مگر پرمٹ زیادہ تر "کھڑکی" سے نہیں باہر سے ملتا تھا۔ باہر پرمٹ کا بلیک مارکیٹ تھا۔ ایک ایک پرمٹ سو سو اور دو دو سو روپیہ میں ملتا تھا۔

اسی لئے میں قطار سے باہر نکل آیا۔ میرے ایک رنگین دوست نے جو

ریاست بہاول پور کے رہنے والے تھے اور جو حیدر آباد عثمانیہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے پانچ آدمیوں کا ایک پرمٹ بلیک مارکیٹ سے خرید لیا۔ جو ہوائی سفر کا تھا۔ نظر حیدر آبادی سے میں نے ڈیڑھ سو روپے قرض لئے اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔

ارتھ انڈیا سے ایر انڈیا میں

دوسرے دن سویرے میں اپنے بہاولپوری دوست وزیر محمد خاں پرسنل سکریٹری مجاہدِ اعظم قاسم رضوی، ایوب خاں اور ولی محمد خاں کے ساتھ جو ہو کے ایروڈروم پر تھا اور میری آنکھوں کے آگے "ایر انڈیا" کا ایک ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں نے ایروڈروم کے بک سٹال سے ملک راج آنند کا ایک ناول (Two Leaves and a Bud) اور ایر انڈیا کا ایک چھوٹا سا پمفلٹ خریدا۔ جس میں مسافروں کے لئے بڑی دلچسپ ہدایات درج تھیں مثلاً

(ا) "جب آپ ایرپورٹ پر آئیں تو جہاز کے سامنے نہ جائیں جہاز کا پنکھا نہ تو آپ کو جانتا اور نہ آپ کے اعزاز و مرتبے سے واقف ہے۔ ورنہ یہ کتنا مضحکہ خیز منظر ہوگا کہ آپ اپنے ہاتھوں میں ایک فٹ بال لئے کھڑے ہوں جو پہلے آپ کا سر تھا۔"

(ب) ہماری کوئی خاتون مسافر جن کا وزن کسی وجہ سے بڑھ گیا ہو اپنا وزن

کراتے وقت مطلق نہ شرمائیں۔ یہ صحیح ہے کہ چند لمحوں کے لئے آپ کے وزن کا راز ہمیں معلوم ہو جائے گا لیکن مطمئن رہئیے آپ کا راز صرف تین ہستیوں تک محدود رہے گا۔ ایک آپ خود۔ دوسرا خداوند عظیم و برتر اور تیسرا ہمارا ڈبلیو اینڈ ٹی الوری آفیسر"

(ج) ہمارے ان مرد مسافروں سے جنہوں نے چھٹی جماعت کے بعد تعلیم ختم کر دی ہماری اتنی درخواست ہے کہ وہ ایرپورٹ پر جہاں جی چاہے گھومیں مگر لیڈیز کلاک روم میں ہرگز نہ جائیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم کلاک روم کے دروازوں پر مرد اور عورت کی تصویریں نہیں بناتے۔ اس لئے کہ ہندوستانی ریلوے نے اس "آرٹ" پر اجارہ داری قائم کر لی ہے۔

(د) اگر آپ اپنی محبوبہ کو مچھر دانی میں لپیٹ کر یا برقع اوڑھا کر لائیں گے تو ہمارے جہاز میں اس کے لئے کوئی الگ جگہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس کو مچھر دانی میں لپیٹنے اور برقع اوڑھانے پر مُصر ہیں تو ہم آپ کی محبوبہ کو آگے پائیلٹ کے ساتھ بٹھا سکتے ہیں جہاں پائیلٹ، سکپر اور ریڈیو آفیسر جیسے خدا ترس انسانوں کے سوائے اور کوئی نہیں ہوتا۔

(ح) ہم اپنے زیادہ گرم خون والے مرد اور عورت پسنجرز سے درخواست

کرتے ہیں کہ جہاز کی روانگی سے قبل وہ سب مسافروں کی موجودگی میں ایک دوسرے کا بوسہ نہ لیں کیونکہ باقی مسافروں کے لئے ہمارے پاس چیونگ گم کے سوائے کچھ نہیں ہے۔

نو بج کر پچیس منٹ پر ایرپورٹ افسر نے میرا "فرضی نام" پکارا جہاز کو لیڈر رانگ چکا تھا۔ اور ہوسٹس مس ٹی جروس (Miss T. Jervis) نے سر جھکا کر مسکرا کر مجھے گڈ مارننگ کہا اور میں مسکراتا ہوا جہاز کی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

مس ٹی جروس نے آسمانی رنگ کا سکرٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پہ آسمانی رنگ کی ایک بیرٹ کیپ تھی جس پہ "ایرانڈیا" کا مونوگرام تھا۔ اور دونوں کندھوں پر پیتل کے دو ہوائی جہاز لگے ہوئے تھے۔ وہ میری طرف مسکراتی ہوئی آئی۔ انیس بیس سالہ سرخ و سفید رنگ کی بھرے بھرے متناسب جسم کی لڑکی جس کی نیلگوں آنکھوں میں چمک اور حسن سے زیادہ جنسی کشش تھی۔ اس نے میرے پیٹ پر "سیٹ بیلٹ" کس دیا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے جہاز جوہو کے ایروڈروم سے اڑا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب ڈر اور خوف کی پرچھائیاں میرے چہرے پر سے ہٹ چکی تھیں۔

اب نہ میں ہندوستان میں تھا اور نہ پاکستان میں۔ اب میں ہندوستانی جمہوریت اور پاکستانی جمہوریت سے دور اور بلند تھا میرا دل اپنی ننھی بچی لی لی کی طرح مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہوائی جہاز زندگی بھر یوں

ہی اڑ رہا ہے اور میں ایک بے فکر زندگی کا خمار لئے یوں ہی جیتا رہوں اور مس جروس کی ادھ کھلی کلیوں جیسے سرخ سرخ ہونٹوں کو ہمیشہ ہمیشہ دیکھتا رہوں۔

ہوائی جہاز اڑ رہا تھا۔ اور کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر میں اس زمین کو دیکھ رہا تھا جہاں صدیوں پہلے آدم اور حوا اتارے گئے۔ جہاں ان کی نسل پھیلی۔ جس نے زمین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ جس کی بدولت زمین، زمین نہ رہی۔ یورپ اور ایشیا بن گئی۔ امریکہ اور افریقہ بن گئی۔ کبھی نپولینی فرانس بنی، کبھی نازی جرمنی، کبھی بھوکا بنگال بنی اور کبھی خونیں پنجاب —— زمین جس پر انسان پیدا ہوتا ہے۔ چلتا پھرتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ محبت کرتا ہے۔ نفرت کرتا ہے لڑتا ہے جھگڑتا ہے۔ اور اسی زمین میں دفن ہو جاتا ہے۔ زمین جو کہیں بادشاہ کی ملکیت ہے تو کہیں زمیندار کی —— اور جس زمین پر انسان کو ابھی تک قبضہ و اختیار حاصل نہیں۔

وہی زمین ہوائی جہاز کی کھڑکی سے ایک بہت بڑا مٹی کا ڈھیر نظر آرہی تھی ہرے بھرے کھیت یوں نظر آتے تھے جیسے کسی نے سبز اور مٹیالے قالین اور دریاں سوکھنے کے لئے بچھا دی ہوں۔ دریا اور ندیاں سانپوں کی طرح رینگتے نظر آرہی تھیں —— اور بادل کے ٹکڑے کثیف دھوئیں کے مرغولوں کی طرح جہاز کے نیچے سے بہے جا رہے تھے۔

میں بہت خوش تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے زمین سے فرار ملا تھا میں بہت ہی خوش تھا۔ کیونکہ زمین پر جینا بہت مشکل ہے۔ زمین پر زندگی ہی دشوار گزار ہے

زمین پر ہمیشہ ایک ہی خواہش بار بار دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کبھی کبھی رابنسن کروسو کا جزیرہ مل جائے کہیں —— اور یہ جہاز رابنسن کروسو کا اڑتا ہوا جزیرہ تھا۔ جہاں زمین نہ تھی۔ زمین کا درد نہ تھا۔ سیاست نہ تھی۔ مذہب نہ تھا۔ صرف مس جروس تھی۔

مس جروس جس کے آسمانی لباس پر اس کا کندنی چہرہ یوں جگمگاتا تھا جیسے نیلگوں آسمان پہ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہو۔ جس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا تھا جیسے واللہ وہ عورت نہیں قرۃ العین حیدر کی کوئی طویل مختصر کہانی ہے —— میرے قریب آئی اور میرے سامنے ایک اوپنین بک (opinion Book) رکھ دیا اور اپنا شیفر کا خوب صورت فاؤنٹن پن میری انگلیوں میں تھما دیا۔ میں نے کیا لکھا مجھے یاد نہیں کیونکہ مس جروس کی نیلگوں آنکھوں میں جیسے الف لیلیٰ کا بازار تھا جس میں میں دیوانہ وار بھٹک کر رسوا ہو رہا تھا۔

اس کے بعد مس جروس چلی گئی اور پھر آئی۔ اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک "ٹرے تھی جس میں چاکلیٹ، ٹافی، پیپر منٹ، اور چوینگ گم تھے۔ میں کچھ بھی نہ لے سکا صرف اس کے سرخ سرخ ہونٹوں کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ کچھ کچھ "کانشیس" اور کچھ کچھ "بلش" ہو گئی تھی۔

پانچ منٹ بعد مس جروس پھر آئی اور اس نے میرے سامنے "لائف، پکچر پوسٹ، ٹرو سٹوری میگزین، جان بل، اسٹرینڈ للی پٹ، ورلڈ ریویو، فلم انڈیا، فلم گوئیر، ریڈرس ڈائجسٹ اور کئی رسالے رکھ دیئے۔ مگر میں نے کوئی رسالہ نہیں لیا اور

اس سے پوچھا:

"ان میں ساری باتیں اسی زمین کی ہوں گی جسے ہم بہت نیچے چھوڑ آئے ہیں کیوں ٹھیک ہے نا ــــــ؟"

وہ عجب ناز سے مسکرا کر دوسرے مسافر کی طرف چلی گئی۔ رسالے تقسیم کرنے کے بعد وہ ریڈیو آفیسر کا ایک پیغام لئے آئی جس پر لکھا تھا:

ہم اس وقت زمین سے اتنے ہزار فٹ بلند ہیں۔ ہمارے نیچے دائیں طرف سمندر ہے اور بائیں طرف ایک شہر..........

مگر میں نے اتنا پڑھ کر وہ میسیج لوٹا دیا۔ اور اس سے کہا:

"مجھے زمین سے نفرت ہے مس جروس"

اس نے عادتاً مسکرا کر برجستہ جواب دیا:

"مگر زمین سے نجات بھی تو ممکن نہیں!"

میں اس "ذہین خوب صورتی" کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب مسافروں کے لئے چائے اور کافی لئے آئی۔ اور میرے سامنے سیٹ پر چائے کی ٹرے رکھ کر بیٹھ گئی اور بولی:

"میں بھی تمہارے ساتھ چائے پیوں گی۔"

میں نے خوش ہو کر جواب دیا:

"میں بھی یہی چاہتا تھا۔ بائی گاڈ میں بھی یہی چاہتا تھا۔"

پھر اس نے دو پیالیوں میں چائے بنائی اور ہم پیٹیو چپس اور مکھن لگے سلائیس

کھانے لگے۔ اور چائے پینے لگے اور باتیں کرنے لگے۔ اس نے مجھے بنانے کے لئے کہا:

"یہ سب چیزیں بھی زمین کی ہیں اور میں بھی زمین کی رہنے والی ہوں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوب کر جواب دیا:

"نہیں نہیں۔ تم زمین کی رہنے والی نہیں ہو مس جروس۔ تم تو پون رانی ہو۔ جانتی ہو۔ پون رانی کسے کہتے ہیں۔ فضاؤں کی ملکہ ——— "کوئین آف دی ایر۔"

وہ عام نوجوان لڑکی کی طرح شرما گئی۔ مسکرانے لگی اور مسکراتی رہی۔ اور میں سوچنے لگا کہ "ارتھ انڈیا" کے مقابلے میں "ایر انڈیا" کتنی انسانی جگہ ہے جہاں نہ مسجد ہے نہ مندر، جہاں محل ہے نہ جھونپڑی، جہاں فرقہ پرستی ہے نہ قوم پرستی ——— جہاں صرف مس جروس ہے۔

بنت ماہِ تاباں مس جروس
فاتح نگاراں مس جروس
نگارِ دہر فگن مس جروس
فضاؤں کی ملکہ مس جروس

عشق میں بہت حدّت پیدا ہو چکی تھی اور مس جروس کی گھڑی میں بارہ بج رہے تھے۔ جہاز کہیں زور زور سے "ڈمپ"، کر جاتا تھا۔ مس جروس چائے کی ٹرے اٹھا کر لے گئی اور بیس منٹ بعد وہ پھر آ گئی اور جہاز کی کھڑکی سے باہر

دیکھتے ہوئے چیخی :-

یوری گا ـــــــ !

زمین ـــــــ !

اور میرا سیٹ بیلٹ پھر میرے پیٹ پر کس دیا اور منحوس اور بے حد منحوس خبر سنائی کہ ـــــــ اب ہم لینڈ کرنے والے ہیں -

زمین

زمین

میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی بہت ہی سہانا خواب زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا ہو - جہاز لینڈ کر چکا تھا - جہاز زمین پر دوڑ رہا تھا - جہاز کراچی ایروڈروم کے سامنے رک گیا تھا - میں اپنی سیٹ سے اٹھا - جب سب مسافر اتر گئے تو میں نے مس جروس سے کہا :-

آل رائٹ یو کوئین آف دی ایئر ـــــــ اب ہمیں جدا ہونا ہے - تم سچ کہتی تھیں کہ زمین سے نجات بھی تو ممکن نہیں - مجھے تم سے جدا ہونے کا عجیب سا رومنٹک ساد کھ ہے مگر خیر میں زمین کا باشندہ اور تم فضاؤں کی رانی -

آرچ ـــــــ چھا ـــــــ چیریو -

اس وقت جہاز کا پائیلٹ بھی وہاں آ گیا اور اس نے مس جروس کو شریر آنکھوں سے گھورتے ہوئے مجھے مخاطب کیا -

" ویل جنٹلمین ـــــــ تمہیں ہماری ہوسٹس بہت پسند آ گئی ؟ سچ ہے - ہماری لڑکی اور مسافروں کا رشتہ عجیب ہوتا ہے ـــــــ دیکھو یہ مسافر کا کتنا خیال

رکھتی ہے انہیں کھلاتی پلاتی ہے۔ انہیں بلانکٹ اڑھاتی ہے۔ ان کے ساتھ ہنستی ہے ——— بے شک فطری ہنسی ہنستی ہے۔ مسافروں کے غم میں شریک ہوتی ہے ——— یہ بالکل ویسی ہی ایک بات ہے کہ ماں کی محبت فطری اور پیدائشی محبت ہوتی ہے۔

وہ زور سے ہنس پڑا۔ اور میں نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ مس جروس کے مرمریں ہاتھوں کی طرف بڑھایا۔ اس کے گرم گرم ہاتھ کو تھوڑی دیر تک اپنے ہاتھ میں دبائے رکھا اور پھر ہاتھ چھوٹ گئے۔

اور مس جروس خواب کی لڑکی کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

دوسری اسلامی مملکت

کے دروازے پر

ایک اسلامی مملکت سے دوسری اسلامی مملکت میں ....

یعنی میں مملکت خداداد پاکستان کے دروازے پر ایک اجنبی بھکاری کی طرح کھڑا تھا۔ جس کے کشکول میں اب صرف سات روپے کچھ آنے باقی رہ گئے تھے!

بمبئی سے کراچی پہنچ کر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں کوئی دوسرا کولمبس ہوں جس نے تیسری دنیا دریافت کی ہے۔ کولمبس کے امریکہ اور میرے پاکستان میں حیرت ناک، حد تک مشابہت تھی۔ ویسے تو سب جانتے ہیں کہ کراچی مملکت خداداد پاکستان کا دارالخلافہ اور مشہور بندرگاہ ہے مگر راز کی بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کراچی بھی دہلی کی طرح نیویارک اور لندن کے بیچوں بیچ واقع ہے ـــــــ وہی ڈالر شہر!

پاک ایئرلائنز کی ویگن جب مجھے پاک ایر کے سٹی آفس پر چھوڑ گئی تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں؟ ـــــــ بڑا پریشان تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے پاکستان آنے کی بڑی خواہش تھی اور اب پاکستان آکر پاکستان میں داخل ہونا ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا تھا ـــــــ لیکن میرے ہم سفر اور میرے ہم وطن مسٹر وزیر محمد خاں، ایوب خاں اور ولی محمد خاں نے میری پریشانی بھانپ لی اور جب انہوں نے ایک وکٹوریہ کرائے پر لی تو اپنے سامان کے ساتھ میرا سامان بھی رکھوا دیا۔ میں کچھ نہ بولا۔ شکریئے کا ایک لفظ بھی نہیں۔ چپ چاپ وکٹوریا میں بیٹھ گیا۔ جب وکٹوریہ نے ہمیں نگار ہوٹل، پر چھوڑا تو ایک اور مشکل آن پڑی۔ وکٹوریا والے کو ہم نے دو روپے کرایہ ادا کیا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ تین روپے دیئے پھر بھی اس نے انکار ہی کیا۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ کرایہ کم نہیں بلکہ کرایہ پاکستانی نہیں ہے۔ وکٹوریہ

والا کہہ رہا تھا:

"یہ سالا ہندوستانی سکہ ہے، ادھر نہیں چلتا۔"

سالا ہندوستانی سکہ پاکستان میں نہیں چلتا اور سالا پاکستانی سکہ ہندوستان میں نہیں چلتا —— البتہ سالا انگریزی سکہ دونوں میں نہ صرف چلتا ہے بلکہ دونوں ملکوں پر بیٹھا ہوا بھی ہے —— وکٹوریہ والے کے اس انکشاف کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری جیب، کاٹ لی گئی ہے۔ وہ بچے کھچے سات روپے کچھ آنے بھی مجھے حیدرآباد کے ان حالی سکوں کی طرح نظر آنے لگے جو میری بش شرٹ کی آستین کے اندر "امام ضامن" میں بندھے ہوئے تھے —— آخر کار ہم نے "نگار ہوٹل" کے مالک کے پاس ہندوستانی روپے بطور ضمانت رکھے اور پاکستانی سکے حاصل کئے" وکٹوریہ والے کا کرایہ ادا کیا اور کمرہ نمبر ۷ میں آباد ہو گئے اور ایوب خاں نے عادتاً اپنے مخصوص لہجے میں ہندوستان کو اور حضور نظام کو ماں بہن کی ایک بھرپور فحش گالی دی!

کراچی پہنچ کر ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم گھوم کر پھر حیدرآباد دکن واپس پہنچ گئے ہیں، کیونکہ بندر روڈ پر، میکلوڈ روڈ پر، فریئر روڈ اور ہر روڈ پر ہمیں لمبی مصری ٹوپی اور اونچے کالروں والی شیروانی میں ملبوس کوئی نہ کوئی حیدرآبادی مل جاتا اور پھر "جی ہو" اور "نکو" شروع ہو جاتی —— لیکن بیشتر حیدرآبادی سنگین جرائم کے مرتکب رضاکار تھے، جو کسی نہ کسی طرح بچ کر بھاگ آئے تھے اور ان کے جرائم اور گناہوں کا بدلہ حیدرآباد میں معصوم رضاکار اور بے گناہ مسلمان بھگت

رہے تھے۔

اپنے ہم زلف عثمان صحرائی صاحب کو زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ انہوں نے فرمایا:

"اچھا کیا تم آ گئے۔ اب اپنے قلم سے مملکت اسلامیہ پاکستان کی خدمت کرو۔"

ایوب خاں اور وزیر محمدؐ خاں نے کہا:۔

"ہمارے ساتھ رہئے اور خدمت اسلام کیجئے۔ آپ کی تحریر میں جوش ہے، ولولہ ہے، کشش ہے، مسجدوں کے منبر اور پبلک جلسوں کے پلیٹ فارم آپ کے منتظر ہیں!"

ہدایت اللہ نے کہا:

"ریڈیو اور اخبارات میں آپ کو یوں ملازمت مل سکتی ہے۔ پاکستان کو آپ کے فاؤنٹین پن کی شدید ضرورت ہے۔"

نوعمر دوست سجاد نے جو قاسم رضوی صاحب کا باڈی گارڈ تھا مجھ پر ایک انکشاف کیا:

"یہاں آپ کے لئے لیڈری کا بڑا وسیع میدان ہے۔"

بہت سے دوست مجھے لیڈر بنانے پر تل گئے۔ پبلشرز میری کتاب "ترنگے کی چھاؤں میں" کا دوسرا، تیسرا، چوتھا ایڈیشن منہ مانگے داموں پر چھاپنے کے لئے تیار تھے۔ ایک پبلشر مجھے پانچ سو روپے پیشگی اس شرط پر دینے کے لئے تیار تھا کہ میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اس کے گھر چلوں اور آٹھ دن کے اندر اندر ایک ایسی

کتاب لکھ دوں جس میں حیدر آبادی مسلمانوں پر ہندوستانی فوج اور حیدر آبادی ہندوؤں کے ان وحشیانہ اور انسانیت سوز مظالم کی داستانیں ہوں جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اور جن کے بارے میں میں کچھ نہ جانتا تھا!

پاکستان کے سب سے بڑے اسلامی شاعر ماہرالقادری نے مجھے خط لکھا:

"پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ آپ کے نام کا پہلا لفظ ابراہیم ہے خدا کے لئے اپنے جوشِ ایمان سے الحاد و انکار کی آتش کو گلزار بنایئے!"

ایک اسٹنٹ فلم پروڈیوسر نے مجھے پانچ ہزار روپے کے عوض مجاہدِ اعظم سید قاسم رضوی کی زندگی اور رضاکاروں کے جہادِ آزادی کے بارے میں فلمی کہانی لکھنے کی دعوت دی۔

انہی دنوں میں سید وقار عظیم سے ملا۔ موصوف نے 'ماہ نو' کی جائنٹ ایڈیٹر شپ پر بہ مشاہرہ دوسو روپے ماہوار میر التقرر بھی کرا دیا۔

میرے قدم ڈگمگانے لگے!

میری آنکھوں کے سامنے لیڈری کا پرشکوہ اعزاز تھا۔

میری سات روپے کچھ آنے والی جیب کے سامنے ایک پبلشر کے پیشگی پانچ سو روپوں کا چیک کھلا ہوا تھا۔

میرے سامنے ایک فلم پروڈیوسر پانچ ہزار روپوں کی تھیلی لئے بیٹھا تھا۔ 'ماہ نو' کی سرکاری اور مستقل ملازمت مجھے بلا رہی تھی!

میں بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ اور فیصلہ کر لیا کہ میں دوبارہ

اندھیرے کا دھوکہ نہیں کھانا چاہتا۔ میں دوبارہ اسلام کے نام پر مسلمان عوام کو فریب دینا نہیں چاہتا۔ میں نے ایک اسلامی مملکت کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے مذہبی تعصب اور فرقہ واری نفرت کے آتش کدے میں ہزاروں معصوم انسانوں کو اپنی آنکھوں کے آگے جلتے اور مرتے دیکھا ہے —— اور میں —— میں خود کتنی ہزار ہا بے گور و کفن سڑتی گلتی لاشوں کو روندتا، الانگتا پھلانگتا یہاں پہنچا ہوں۔ اب پھر لاشوں کے ڈھیر پر اپنی نئی لیڈری کا اعزاز سنبھالوں؟ میری جیب میں چونکہ سات روپے اور کچھ آنے ہیں اور سامنے لیڈری اور نوکری کی کرسیاں ہیں اور پانچ سو اور پانچ ہزار روپوں کے چمکیلے ڈھیر ہیں۔ اس لئے پھر انسانوں اور انسانوں کے درمیان نفرت کی تجارت شروع کر دوں —— ؟!

یہ بہت آسان بات ہے کہ میں بندر روڈ کے کسی چوراہے پر یا کراچی کی کسی نو تعمیر مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اپنے گرد ہزاروں سادہ لوح مسلمانوں کو دوبارہ جمع کر لوں لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ زمانہ، تاریخ اور انسان دوسری بار میرے جرم کو معاف کر سکے —— پاکستان دوسرا حیدر آباد ضرور ہے مگر پاکستان کو دوسرا حیدر آباد نہیں بننا چاہئے۔

میں نے پینشنر سے کہہ دیا:

"میں "ترنگے کی چھاؤں میں" دوبارہ نہیں چھپانا چاہتا۔ ایک حماقت کو پھر کوئی نئی شکل اور نیا لباس نہیں پہنانا چاہتا —— یہ اپنے زہر کو نئی شیشی میں نہیں

بھرنا چاہتا۔"

میں نے فلم پروڈیوسر سے کہہ دیا:

"میں پاکستانی عوام کو مذہبی اور فرقہ واری تعصب کے انجکشن نہیں لگانا چاہتا۔"

دوستوں سے عرض کیا:

"اب میرے لئے لیڈری کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ حیدرآباد کے بازار میں نفرت کی سودے بازی میں میں نے ناقابل تلافی نقصان اٹھایا ہے ــــ اب میں 'انسان' سے ملنا چاہتا ہوں۔"

چھ روز تک کراچی میں میں شدید بخار اور مفلسی میں مبتلا رہا۔ مجھے ڈر تھا۔ کہ کہیں میری یہ دونوں کمزوریاں میرے قدموں کو نہ ڈگمگا دیں اور میں پھر اندھیرے جنگل میں راستہ بھٹک جاؤں ــــ اس لئے میں نے ساتویں روز اپنے دوست وزیر محمد خاں سے تیس روپے قرض لئے اور میرے دوست سجاد نے مجھے سندھ ایکسپریس کے تیسرے درجے میں سوار کرا دیا۔

حیدرآباد سندھ تک میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اور بیٹھنے کی کوشش کرتا رہا مگر مجھے بخار تیزی سے چڑھنے لگا تھا۔ میرے سامنے کی سیٹ پر گوجرانوالہ ضلع کا ایک بوڑھا کسان اور اس کی بیوی بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری حالت کو بغور دیکھا۔ کسان نے میری نبض اور میرا ماتھا چھو کر دیکھا۔ اس کے بعد مجھ سے بغیر کچھ کہے اس نے میرا بستر کھول کر سیٹ پر بچھا دیا اور بولا:

"بیٹا جی ــــ تینوں تپ چڑھی وی اے۔ توں ایتھے سوں جا۔"

اس کی بیوی نے اپنی میلی کثیف تھیلی سے ملٹھی قسم کی کوئی چیز نکالی اور مجھے دیتے ہوئے کہا:

"پتر — ایہنوں کھائے۔ آرام آجاؤ گا۔"

میں نے اس کسان اور اس کی بیوی کی طرف شکرگزار نظروں سے، ممنون نظروں سے نہیں بلکہ مجرم نظروں سے دیکھا۔ کیونکہ آج سے ایک سال پہلے تلنگانہ کے کھیتوں میں میں اسی کسان کا ساتھ چھوڑ کر اس کے دشمنوں یعنی زمینداروں مہاجنوں اور جاگیرداروں کی اونچی اونچی گناہ گاہوں اور عالیشان محلوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑنے میں میں نے اس کے دشمنوں کا غیر شعوری طور پر ہی سہی مگر ساتھ ضرور دیا تھا۔ آج وہی کسان سندھ اور پنجاب کے اجنبی میدانوں میں یکاوتنہا بخار میں مبتلا دشمن کو موت کے منہ میں جانے سے بچا رہا تھا، اپنے طاقت ور بازوؤں سے اپنے دشمن کو موت کے منہ سے چھین کر زندگی کی طرف لئے جا رہا تھا!

میں بخار اور شرمندگی سے پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میرا ماتھا دیکھتا۔ اس کی بیوی جو اس اجنبی سرزمین پر جہاں میں بالکل اکیلا تھا، اپنی ساری ممتا مجھ پر نچھاور کر رہی تھی۔ بار بار مجھ سے پوچھتی:

"پتر — من کی حال اے تیرا؟"

تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری سگی ماں دوبارہ زندہ ہوگئی ہے اور اپنے بچے کو اجنبی زمین پر یکاوتنہا کس مپرسی کے عالم میں بخار اور مصیبت میں گھرا

دیکھ کر بے چین ہے، پریشان ہے ـــ پکار رہی ہے ـــ "میرے بچے!"

ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن سوائے اس بوڑھے کسان اور اس کی عورت کے کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی بلکہ ایک خوش پوش صاحب تو یہ فرما رہے تھے کہ مجھے بخار وخار کچھ نہیں، میں ایسے ہی بہانہ کر کے لیٹا ہوں تاکہ مجھے سونے کے لئے جگہ مل جائے۔ وہ مجھے اٹھانا چاہتے یا ہر نئے اسٹیشن پر نئے مسافر مجھے جگانا چاہتے تو بوڑھا کسان غصے سے اٹھ کھڑا ہوتا اور غضب ناک لہجے میں کہتا:

"اوئے ـــ اودھر ناں جا۔ اے بندہ بیمار اے۔"

وہ کسان اس طرح میری تیمارداری اور میری خبرگیری کر رہا تھا۔ جیسے میں اس کا اپنا بچہ ہوں اور وہ پوری محبت سے میری حفاظت کر رہا ہے۔ جب رات ہو گئی تو بخار کی حدّت سے میرا حلق، میرا تالو اور میری زبان بار بار خشک ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنے سرہانے بیٹھے خوش پوش صاحب سے (جو انارکلی کے ایک جنرل مرچنٹ تھے، جن کے پاس واٹر باٹل تھی) پانی مانگا تو وہ گھبرا گئے کہ کہیں ان کے گلاس یا پانی میں میرے بخار کے جراثیم نہ پہنچ جائیں دو تین بار وہ انجان ہو گئے مگر اس کسان عورت نے پانی کی ایک لٹّی سی بالٹی میرے سامنے کر دی اور بڑی محبت سے بولی:

"ایہہ لے پُتر ـــ ایہہ پانی پی لے۔ ایہہ وی چنگا اے۔"

اور پھر لاہور تک میں اسی بالٹی کا پانی پیتا رہا۔ یہ پانی جس میں ایک غریب آدمی کی محبت، ایک ماں کی ممتا اور ایک انسان کی انسانیت گھلی ہوئی

تھی - میرے لئے وہ بالٹی کا پانی نہیں آبِ حیات تھا!

سویرے سویرے میرا بخار کچھ کم تھا۔ کسان نے میرا ماتھا دیکھا اور بڑی خوشی سے بولا:

"پتر ــــ ہن تیرا بخار گھٹ گیا اے۔"

آٹھ بجتے بجتے سندھ ایکسپریس لاہور اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں نے اپنا بستر باندھنا چاہا مگر بوڑھے کسان نے مجھے اپنی جگہ پر بٹھا دیا، میرا بستر باندھ دیا اور میرا سامان بھی قلی کی طرح اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا:

"چنگا پتر ــــ رب تینوں چنگا کرے۔ اسی ہن چلے آں۔ راضی خوش رہ!"

بڑھیا نے میرے سر پر شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیرا اور وہ دونوں غریب اور مخلص انسان اپنی اپنی گٹھریاں اٹھائے اپنا انسانی فرض ادا کر کے چلے گئے۔ وہ کون تھے؟ ان کے نام کیا تھے؟ کیا زندگی کے راستے پر وہ پھر کبھی مجھے مل سکیں گے؟ میں نہیں جانتا۔ بس انہیں احسان مندانہ نگاہوں سے بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ریلوے پلیٹ فارم کے لمبے پل پر، مسافروں اور اسباب کے ہجوم میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں ان کا شکریہ تک ادا نہ کر سکا لیکن انہوں نے شکریئے کی خاطر میری تیمارداری نہیں کی تھی کیونکہ وہ انار کلی کے سوداگر نہیں تھے ــــ کسان تھے، وہی کسان جن کے ساتھ میں نے تلنگانہ کی کھیتیوں میں غداری کی تھی، جنہیں دھوکا دیا تھا

اب وہی کسان سندھ اور پنجاب کے کھیتوں میں اپنے پرانے دشمن کو نئی زندگی بخش کر اور اچھی زندگی کی دعائیں دے کر چلے گئے تھے!

لاہور —— ایک اور ڈالر شہر۔

ایک ہوٹل کا ایجنٹ میرے قریب آیا۔

"آپ ہوٹل میں ٹھہریں گے صاب۔ میرے ساتھ آیئے۔ بالکل نیا ہوٹل، بالکل پاکستانی ہوٹل —— بہترین کمرے، اعلیٰ فرنیچر، شاور، فلش، سب کچھ۔ ایکسی لنٹ اریننج منٹ —— اور —— اور ہندوؤں سے لوٹی ہوئی بلڈنگ صاب۔"

آخری خصوصیت بتا کر وہ جیسے مجھ میں مذہبی نفرت کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا تھا —— میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

سامان ہوٹل میں رکھ کر میں اپنے دوست "ابن انشا" کی تلاش میں ریڈیو اسٹیشن گیا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ چھٹی پر ہے۔ یہ خبر سن کر میرا بخار جیسے ایک ڈگری اور بڑھ گیا۔ لاہور کی اجنبی سڑکوں پر "ابن انشا" کے بجائے میں کسی ڈسپنسری کو تلاش کرنے لگا۔ گھومتے گھومتے اچانک میری نظر ایک سائن بورڈ پر پڑی —— اخبار انقلاب —— میں نے سوچا یہاں سے احمد ندیم قاسمی کا پتہ لگانا چاہئے۔ مگر نہ صرف دفتر بند تھا بلکہ اخبار بھی کئی روز سے بند تھا۔ میری رہی سہی ہمت جواب دے گئی اور مجھ میں چلنے کی مطلق تاب نہ رہی۔ ناچار میں دفتر کے سامنے ایک بند دوکان کے چبوترے

پر بیٹھ گیا — مجھ کو کون پہچاننے والا تھا یہاں کہ میں ہی ابراہیم جلیس ہوں۔ ایک پٹھان جو بڑی دیر سے انقلاب کے پھاٹک پر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرے قریب آیا اور مجھ سے پوچھا:

"تم یہاں کس سے ملنے آیا تھا۔"

میں نے جواب دیا:

"احمد ندیم قاسمی کو!"

وہ پٹھان پڑھا لکھا اور معزز آدمی تھا، بھاری بھرکم، جس نے اجلے لٹھے کی بھاری شلوار اور سیاہ دھاری دار ٹویڈ کا کوٹ اور سر پہ کلف لگے طرے کی پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے کہا:

"احمد ندیم قاسمی تو بہت مشہور آدمی ہے۔ اس کا پتہ چل جائے گا۔ ہم یہاں غلام رسول مہر صاحب سے ملنے آیا تھا۔ چلو ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم اس کا پتہ کرا دے گا۔"

مگر میں اٹھ نہ سکا اور اسے اپنا سارا دکھ بھرا افسانہ سنا دیا۔ اس نے حیرت سے کہا:

"اوہ — تم حیدرآباد دکن کا رہنے والا ہے۔ ہم بھی وہاں ۱۹۴۲ء میں رہ چکا ہے۔ حیدرآباد کا لوگ بڑا شریف اور بڑا اچھا ہوتا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں جب تک احمد ندیم قاسمی نہ ملے تم ہمارا مہمان ہے۔ ہم ابھی تم کو اپنے ایک دوست حکیم صاحب کے پاس لے جائے گا، وہ تمہارا سارا بخار اتار کر رکھ دے گا۔"

یہ کہہ کر میرے نئے محسن نے تانگہ منگوایا اور مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں

ایک بوڑھے حکیم صاحب نے میری نبض اور میرا سینہ ٹھونک بجا کر دیکھا اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک جوشاندہ قسم کی دوا کٹورے میں بھر کر مجھے پلا دی۔ مجھے ایک چارپائی پر لٹا دیا ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں بالکل تندرست ہوں۔ اس کے بعد میرے نئے محسن نے، جس کا نام مبارک شاہ تھا مجھے ناشتہ کرنے کے لئے اٹھایا۔

ناشتے کے بعد آزاد سرحد کا وہ آزاد انسان جس کے دل میں ہمالہ کی چوٹیوں کا فراز تھا تانگے میں بٹھا کر مجھے مسلم ٹاؤن لے گیا، جہاں ایک کوٹھی کے برآمدے میں کتابوں کے انبار والی میز کے پاس ایک بوڑھا عالم انسان آرام کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا ـــــ مولانا غلام رسول مہر جنہیں احمدؔ ندیم قاسمی کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ مگر مولانا مہر کے پاس میرے لئے مایوسی نہیں تھی۔ انہوں نے متصلہ کوٹھی میں آواز دی۔ مولانا عبدالمجید سالک کوٹھی سے نکلے انہوں نے بتایا "احمد ندیم قاسمی نسبت روڈ پر ڈاکٹر قوی لقمان کی ڈسپنسری کے پیچھے 'فسانہ خواں' ہیں!"

ہم واپس چلے آئے۔ چار بجے کے قریب میں 'فسانہ خواں' کے گھر کے سامنے کھڑا تھا مگر فسانہ خواں غائب تھا البتہ بہن ہاجرہ مسرور موجود تھیں۔ وہ میرے صحیح سلامت یہاں پہنچ جانے پر اظہار مسرت کر رہی تھیں کہ 'فسانہ خواں' آگیا۔ اس نے میری وحشت ناک شکل دیکھتے ہی پوچھا:

"ابراہیم جلیس ـــــ؟!"

جیسے اسے یقین ہی نہ آتا ہو کہ ایسے وحشت ناک خدوخال والا آدمی

ابراہیم جلیس ہو سکتا ہے ۔۔۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کے خدوخال جتنے دل کش ہیں اس کا دل بھی اتنا ہی خوب صورت ہے ۔ اس کے دل کے دروازے ایک عام معمولی اجنبی انسان تک کے لئے کھلے ہیں، میری تو بات ہی دوسری ہے میں لاکھ وحشت ناک سہی پھر بھی ابراہیم جلیس ہوں ۔

ہاجرہ بہن اور قاسمی صاحب نے کہا :

"آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں؟ آپ کو سیدھا ہمارے پاس آنا چاہئے تھا ۔ آپ نے ہمیں شرمندہ کیا ہے ۔"

میں نے جواب دیا :

"آپ دونوں میرے مقابلہ میں بہت معمولی فن کار ہیں اس لئے میں اپنی حیثیت اور مرتبے کے فن کاروں کا مہمان رہنا چاہتا ہوں ۔ اس لئے مجھے حمید اختر یا "ابن انشا" کی کوٹھیوں کا پتہ بتا دیجئے ۔"

قاسمی صاحب نے اپنی مخصوص اور دل نشیں مسکراہٹ میں جواب دیا :

"مجھے ان دونوں عظیم المرتبت فن کاروں کی کوٹھیوں کا پتہ تو نہیں معلوم لیکن پتہ تو بہر حال پتہ ہوتا ہے یعنی کسی نہ کسی طرح کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی مل ہی جاتا ہے اس لئے آیئے چلیں !"

ایک جگہ ..... ہمارا تانگہ تھوڑی دیر تک نہ جانے کون کون سی سڑکوں پر گھومتا رہا آخر ایک جگہ ٹھہر گیا ۔ میرے سامنے "پیراڈائز کولڈ ڈرنک ریسٹوران تھا اور اس کے اوپر چوہدری نذیر احمد کے مشہور خوب صورت

اور ترقی پسند رسالے "سویرا" کا بورڈ بھی تھا اور دفتر بھی ۔۔۔ قاسمی صاحب مجھے اور مبارک شاہ کو پیراڈائیز ریستوران میں مکھن لگے توسٹ اور چائے کے ساتھ چھوڑ کر اوپر 'سویرا' کے دفتر میں گئے اور تھوڑی دیر بعد لوٹ آئے۔

پتہ چل گیا تھا۔ چائے پی کر ہم 'اوڈین سینما' کے سامنے ایک چینی بگوڈا کے سامنے کھڑے تھے۔ قاسمی صاحب نے دستک دی۔ اندر سے ایک دبلا پتلا عینک پوش 'کنفیوشس' باہر نکلا۔

وہ کنفیوشس نہیں تھا۔ 'ابن انشا' تھا۔ وہ پگوڑا نہیں تھا۔ 'ابن انشا' کا گھر تھا۔ جو بقول قاسمی صاحب اتنا پورٹیبل تھا کہ اسے چور چرا سکتا ہے یا وہ با آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے!

وہ مکان بہت چھوٹا تھا لیکن میرے لئے لاہور اتنا بڑا تھا یعنی اس میں میرے لئے سر چھپانے اور زندہ رہنے کے لئے جگہ تھی چنانچہ میں ہوٹل سے اپنا سامان وہاں لے آیا۔ اس کے بعد بیڈن میکلوڈ کراسنگ پر 'سندباد دی ٹیلر' کی دوکان کے پاس میرا دوسرا محسن مبارک شاہ مجھ سے جدا ہو گیا۔ مبارک شاہ شاید اب مجھے پھر کبھی نہ ملے مگر مبارک شاہ اب شاید کبھی نہ بھلایا جا سکے۔

مبارک شاہ ۔ آئی۔ ایم گریٹ فل ٹو یو فار ایور!

بائی بائی مبارک شاہ!!

اس کے بعد ہم حمید اختر کی تلاش میں نکلے۔ سارے لاہور میں حمید اختر ہی ایک لاپتہ آدمی ہے یعنی لاہور کے ہر ترقی پسند دوست کو یہی شکایت ہے کہ حمید اختر کا پتہ

جتنی آسانی سے مل سکتا ہے، حمید اختر اتنی آسانی سے نہیں مل سکتا۔

چھ بجے کے قریب ہم حمید اختر سے نہیں بلکہ حمید اختر کے پتے سے مل کر لوٹ آئے کیونکہ قاسمی صاحب اور "ابن انشا" کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاس میں شرکت کرنا تھی —— لو جی! آج ہی میں لاہور آیا اور آج ہی ترقی پسند مصنفین کا اجلاس بھی ہے —— میں اپنا غیر ترقی پسند وجود وہاں لے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن قاسمی صاحب نے وعدہ کیا کہ وہاں وہ کسی سے میرا تعارف نہیں کرائیں گے۔

وائی، ایم، سی، اے ہال میں پہنچتے ہی میرے قدم رک گئے کیونکہ سامنے میرا بمبئی کا دوست محمد صفدر صدر بنا بیٹھا تھا۔ صفدر کے نام سے حرف "ف" کے گر جانے سے اس کی شخصیت کتنی بلند ہو گئی تھی! صفدر سے بچنے کے لئے میں قاسمی صاحب کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔

زہیر صدیقی صاحب نے اقبال کی شاعری کے رجعت پسندانہ پہلوؤں پر مقالہ پڑھا تھا اور آغا شورش کاشمیری بڑے برہم ہو کر جوابی تقریر کر رہے تھے —— اور میں صفدر کی بڑی بڑی خوفناک آنکھوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن بچ نہ سکا۔ اجلاس کے بعد سارے یاران ترقی پسند اس رجعت پسندی اور اس فرقہ پرستی کو دیکھنے "ابنِ انشا" کے چھوٹے سے دیوان خانے میں جمع ہو گئے تھے جو مملکت اسلامیہ حیدر آباد سے جان بچا کر مملکت خداداد پاکستان میں اپنی سانسیں طویل کرنے آئی تھی۔ محمدؐ صفدر مجھے دیکھتے ہی پکارا:

"ہیلو فاشسٹ! تم یہاں بھی آ گئے؟"

اس کے بعد دوسرے ترقی پسند ادیبوں سے تعارف شروع ہو گیا۔

آپ احمد راہی

یہ نذیر چودھری

آپ عارف عبدالمتین

مجھے سب سے مل کر بڑی ندامت ہو رہی تھی مگر میں نے سب سے یہی کہا:

"مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!"

اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان میں عبداللہ ملک کوئی نہیں ہے —— لیکن ابھی خدا نے میرا شکریہ قبول نہیں کیا تھا کہ ایک پچیس چھبیس سالہ خوش شکل نوجوان چاکلیٹ رنگ کے سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوا اور بغیر کسی تعارف کے میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا:

"کہئے حلبیس صاحب مجھے عبداللہ ملک کہتے ہیں!"

میرا آگے بڑھا ہوا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ میں پریشان ہو گیا اور بولا:

"اوہ —— آپ —— یعنی ....

عبداللہ ملک نے فوراً کہا:

"یعنی میں عبداللہ ملک ....

میں اور زیادہ پریشان ہو گیا اور سب ہنس پڑے۔ میری خوش قسمتی کہ بہت جلد سارے پنجابڑوں نے "اسی تسی" شروع کر دی اور میں ایک سگرٹ جلا کر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

جب سب چلے گئے اور میں کھانا کھا کر بستر پر لیٹا تو میں نے سوچا کہ میں عبداللہ ملک سے کیوں ڈرتا ہوں، اس سے کیوں گھبراتا ہوں؟ میں تو اس سے زیادہ مشہور ادیب ہوں۔ سارے ہندوستان اور پاکستان میں لوگ عبداللہ ملک سے زیادہ میری عزت کرتے ہیں۔ اس کا میرا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک!

مگر دل ہی دل میں کوئی مجھ کہہ رہا تھا:

"عبداللہ ملک کسی ایک فرد کا نام نہیں، ایک تحریک کا نام ہے عبداللہ ملک کے پاس ایک باشعور اور متوازن ذہن ہے اور تمہارے پاس ایک رومانیہ فضول نگار، وہ انسان کو جانتا ہے اس کے بالمقابل کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا چہرہ دیکھتا ہے مگر تم انسان سے نظریں بچا کر کسی شیش محل کے آئینہ میں اس کا عکس دیکھتے ہو .... وہ عبداللہ ملک نہیں ترقی پسندی ہے اور تم ابراہیم جلیس نہیں رجعت پسندی ہو .... وہ لوئی آراگان، ایلیا اهرن برگ، ھاورڈ فاسٹ اور جیوس فیوچک ہے اور تم اندرے مالو، گرسٹ ماہم، بور ریلیئر اور آندرے ژید ہو......

جب امتحان کا وقت آتا ہے یعنی پیروں تلے زمین کھسکنے لگتی ہے تو جیوس فیوچک ثابت قدم کھڑا رہتا ہے اور آندرے ژید گر پڑتا ہے! مگر میری خودی میری انا مجھے اکساتی ہے:

"تم گر جانے کے بعد بھی عبداللہ ملک سے اونچے ہو۔ ہرگز سر نہ جھکانا۔ یہ تمہاری شکست ہوگی ـــ عبداللہ ملک کی ثابت قدمی آرٹ نہیں، تمہارا متزلزل قدم

آرٹ ہے۔" ادب برائے منزل" محض بکواس ہے۔" ادب برائے ادب" ہونا چاہئے۔" دیکھو ہرگز سر نہ جھکانا۔" اور میں عادتاً اندھیرے میں سو گیا۔

صبح میں ابھی سو ہی رہا تھا کہ احمد راہی اور نذیر چودھری آ گئے۔ اور میرے ارد گرد دوستوں کا حلقہ پھیلتا گیا۔

یہ اخبار امروز کا دفتر ہے ایوب احمد کرمانی ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں۔۔ ہیلو جلیس ۔۔۔ بھئی شکر ہے تم زندہ بچ کر آ گئے۔ لو سگرٹ پیو ۔۔۔ میں بڑی حیرت سے کرمانی کو دیکھ رہا ہوں۔ کرمانی صاحب! کیا آپ وہی ایوب احمد کرمانی ہیں جو عثمانیہ یونیورسٹی کی ہاکی الیون کے جنرل کپتان تھے؟ یہ آپ جرنلسٹ ...... کرمانی صاحب ہنس پڑے اور کہا ۔۔۔ لو چائے پیو ۔۔۔ اچھا جگر وغیرہ خیریت سے ہیں۔ یار! حیدرآباد کی کچھ باتیں بتاؤ۔ مجھے حیدرآباد بہت یاد آتا ہے اوصاف، اشفاق، عاقل، یوسف، ناظم، رضا، ماثر یہ سب لوگ زندہ ہیں یا مار دیئے گئے؟"

شام ہو رہی ہے۔ میں پیراڈائیز ہوٹل کے سامنے کھڑا ہوں احمد راہی نے کہا: ان سے ملو۔ قتیل شفائی۔ ہم گلے لپٹ گئے۔ مجھے دیکھ کر قتیل شفائی کے صحت مند، شاداب چمکتے چہرے پر مسرت کا ایک کوندا لپک گیا ہے ۔۔۔ قتیل شفائی کے ساتھ جمیل ملک اور حسن طاہر ہیں۔

آیئے نا ۔۔۔ چائے پئیں اور باتیں کریں۔

"انڈیا کافی ہاؤس" میں بڑا اشور ہے۔ پاکستان کے بڑے بڑے "انٹلکچولز" بیٹھے بڑی زوردار اور گرما گرم بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایک میز پر مولانا چراغ حسن حسرت،

باری صاحب، مولانا صلاح الدین احمد اور شورش کاشمیری بیٹھے ہیں —— دوسری میز پر شیر محمد اختر، صلاح الدین اکبر، احمد بشیر کولڈ کافی پی رہے ہیں —— ادھر کونے میں قیوم نظر، یوسف ظفر، ریاض قادر، مختار صدیقی اور ضیا جالندھری میرا جی کی کسی تازہ ترین نظم کی تفسیر کر رہے ہیں۔ شاید ایک سی آئی ڈی کا آدمی کہہ رہا ہے —— پاکستان میں 'انڈیا کافی ہاؤس' نہیں رہ سکتا، پاکستان میں تو صرف 'پاکستان کافی ہاؤس' قائم ہو کر رہے گا —— اسی لئے مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری مکتبہ جدید والے چودھری رشید احمد کے ساتھ 'انڈیا کافی ہاؤس' سے باہر جا رہے ہیں۔

برسٹل ہوٹل کے آگے ایک شخص کھڑا ہے۔ میں ابن انشا سے پوچھتا ہوں "کیا جاں نثار اختر لاہور میں ہیں؟" ابن انشا کہتا ہے "نہیں یار!" وہ تو اپنا عابد جشتری ہے۔ تعارف ہوتا ہے۔ عابد جشتری لکھنو کے افسانہ نگار شوکت صدیقی کا بھی دوست ہے۔ شوکت کے حوالے سے ملاقات دوستی میں بدل جاتی ہے۔

یہ "اداکار" کا دفتر ہے —— احمد راہی نے کہا "آؤ ذرا قمر سے ملتے ہیں۔ ہیں اور قمر آج کل ایک نئی فلم کے گیت لکھ رہے ہیں" —— "کون قمر؟" "قمر کو نہیں جانتے، قمر اجنالوی!" —— "اوہ۔ میں جانتا ہوں" اور قمر مجھے عرصے سے جانتا ہے!

تنویر نقوی داخل ہوتے ہیں۔ قمر تعارف کراتا ہے۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری کا مشہور انقلابی شاعر تنویر نقوی —— تنویر نے شام کی دعوت پہ مدعو کر لیا —— میں جھجکا میں پیتا نہیں ہوں۔ مگر چلو کوئی حرج نہیں ہے تنویر نقوی سے مرعوب ہوں اور تنویر نقوی مجھ سے مرعوب ہے۔ اور مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیا کو۔؟

دن بھر گھومتے پھرتے تھک کر ہم چودھری سلطان کی "کتابی دنیا" کے آگے کھڑے نئے پرانے رسائل کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ دوکان کے اندر ایک پستہ قد، مضبوط جسم کا نوجوان جیسے انگریز نامی ہوتے ہیں، بیٹھا ہے یا لیٹا ہے یا........ یہ ریاض جاوید ہے۔ بڑا خطرناک نقاد ہے مولانا صلاح الدین احمد کا ہیٹا رہ چکا ہے۔ اب "مارکسی تنقید" کے میدان میں اتر آیا ہے —— بڑے بڑے نقادوں کے چھکے چھڑا دے گا۔ آؤ ذرا "امروز" کے دفتر چلیں۔

امروز واحد اخبار ہے جہاں نوعمر ذہین ترقی پسند ادیبوں کی بڑی تعداد کام کرتی ہے آپ سے ملئے۔ حسن اعوانی! —— ابھی تو غیر معروف ہیں لیکن دیکھ لینا بہت جلد یہ عوامی شاعر ہزاروں کا محبوب بن جائے گا۔

اور ان سے ملو۔ حمید ہاشمی، انیس ہاشمی سے مل چکے ہو نا —— ان کے چھوٹے بھائی غیر ملکی ترقی پسند لٹریچر کے بارے میں یا ٹرانسلیشن کے سلسلے میں ان سے ملو۔ بڑے مفید ہیں!

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ میں اکیلا میڈیکل کالج کے گرلز ہوسٹل کے سامنے سے گزر رہا ہوں۔ سگرٹ انگلیوں میں ہے۔ ماچس نہیں ہے۔ ساری دوکانیں بند ہیں۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان سگرٹ پیتے سامنے سے چلے آ رہے ہیں میں نے بجلی کے کھمبے کے پاس انہیں روکا —— "ذرا سگرٹ تو دیجئے اپنا سگرٹ جلا لوں" —— "ارے —— ظہیر بابر —— سناؤ بھئی" چین سموکر کرٹیک، "اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو اور یہ گرلز ہوسٹل کے قریب کہاں پھر رہے ہو؟" —— ظہیر بابر کے خوب صورت چہرے

پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے جواب دیا "میں ادھر پرائیویٹ ہوسٹل میں رہتا ہوں ــــــ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

ظہیر بابر نے آدھے سے زیادہ جلتا ہوا سگرٹ پھینک کر دوسرا سگرٹ جلا لیا۔

اُمروز میں میرا ایک مضمون چھپا ہے۔ پانچ کالم ــــــ اوہ۔ گڈ! ــــــ سات روپے فی کالم ــــــ پینتیس روپے ــــــ آؤ بھئی۔ ذرا 'پاکستان ٹائمز' کے دفتر چلیں روپے وصول کریں ــــــ وہاں فیض صاحب سے ملیں گے۔ فیض صاحب پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر ہیں۔ فیض احمد فیض ــــــ ایک دلکش شخصیت۔ مسکراتا چہرہ ــــــ گن گناتا تخیل ــــــ مگر اس کے باوجود چہرے کا ایک ایک نقش فریادی ہے ــــــ میں فیض صاحب سے اتنا مرعوب سا ہو گیا تھا کہ فوراً ہی پھر ملنے کا وعدہ کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں لاہور کی سڑکوں پہ گھومتا رہا۔ لاہور وسیع ہونے لگا۔ لاہور میرے لئے اجنبی نہ رہا۔ لاہور پھیلنے لگا اور پھیلتے ہوئے لاہور کی ایک الجھی ہوئی گلی میں ایک خوانچے والے کے پاس حمید اختر کھڑا کیلا کھا رہا تھا۔ احمد راہی نے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کا لاؤڈ سپیکر ہے اپنی مخصوص گونجیلی آواز میں کہا:

لو بھئی اے۔ حمید چلیں ــــــ یہ حمید اختر کھڑا ہے۔

میں حمید اختر سے لپٹ گیا۔ بمبئی میں ایک سال تک اکٹھے رہنے کے بعد ہم جیسے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے، دوبارہ ملنے کی کوئی امید نہیں تھی کیونکہ پنجاب کے ٹکڑے ہو گئے تھے، اور حیدر آباد اجڑ گیا تھا۔ مگر ہم پھر ملے۔

رات حمید اختر نے اپنے ایک لارڈ فرینڈ عبدالرحیم کے گھر میرے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ ابن انشا نے برا مان کر پوچھا:

"کیوں جلیس۔ کیا تمہیں میرے یہاں کوئی تکلیف ہے؟"

میں نے جواب دیا:

نہیں مائی ڈیر ابناش ——— یہ بات نہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ میں فطرتاً سکالر جپسی (Scholar Gipsy) ہوں ایک جگہ کا کبھی پابند نہیں رہا۔ مجھے تمہارے گھر کیا تکلیف ہو سکتی۔ تمہارے محبت بھرے دل رکھنے والے والدین جو مجھ سے ایسی محبت اور شفقت سے پیش آتے ہیں جیسے کہ میں بھی ابن انشا ہوں تمہارا چھوٹا بھائی ریاض محمد خان جو یہ جان کر بھی کہ مجھے پنجابی نہیں آتی مجھ سے عمداً پنجابی میں باتیں کرتا رہتا ہے۔ ور میرے لئے روزانہ نئی نئی قسم کی سگریٹیں دریافت کر کے لاتا ہے۔ کبھی نیشنل گولڈ فلیک کبھی ڈرایکن کبھی قلنچی کبھی پاسنگ شو کبھی ریڈ لمپ ——— اور جو ایک ڈبیا خریدنے کے بہانے سگرٹوں کی ساری نسل کے بارے میں میرے لئے معلومات فراہم کرتا رہتا ہے مگر یار ابناش! تم کتنے بڑے کنبے کو پال رہے ہو دس بارہ آدمیوں کا خان دان اور تم تنہا کفیل! میں تم پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ ہاں اگر پاکستان جاگیرداروں، سرمایہ داروں کے بجائے ابن انشاؤں کا ہوتا یعنی تمہارے والد کو مشرقی پنجاب کے وطن کی طرح یہاں بھی کھیت مل جاتے اور تمہارا محکمہ تمہاری ادبی مزدوری کا جائز معاوضہ ادا کر سکتا تو میں ہمیشہ تمہارا ہی مہمان رہتا اور ہاں دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے

گھر رہ کر مجھے اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔ سویرے جب زندگی جاگتی ہے تو تمہارے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنیں ریاض، شبدو، میدو، بی بو، کا شور مجھے شہریار، زویا، لی لی، افتخار، اور زبیدہ کی یاد دلاتا ہے۔ جیسے میری صبح حیدر آباد میں ہوتی ہو اور شام لاہور میں .... تم نے تمہارے والدین اور بھائی بہنوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اسے میں بھول نہیں سکتا۔ اس کے لئے شکریہ! ...."

میں رات عبدالرحیم کے گھر شفٹ ہو گیا رحیم کا گھر گویا مہاجرین کیمپ ہے۔ رحیم کا گھر گویا پاکستان ہے، جس میں سب مہاجر رہتے ہیں۔ ایک حمید اختر جو مشرقی پنجاب سے آیا ہے دوسرا راشد حسن جو لکھنؤ سے ہجرت کر کے آیا ہے تیسرا میں جو حیدر آباد دکن سے بھاگ آیا ہوں — چوتھا ہمارا ملازم شیر علی جو نوشہرہ کشمیر کا خانماں برباد ھاتو ہے۔

ہم چاروں میں ایک ہی چیز مشترک ہے — زندگی کا درد — ہم چاروں مشرقی پنجاب، یوپی، حیدر آباد دکن، اور کشمیر سے اپنے ساتھ کچھ نہیں لائے۔ صرف بڑے بڑے بھیانک ماضی ساتھ لائے ہیں جو قدم قدم پہ ہمیں زندگی سے اور دنیا کے مستقبل سے مایوس کر دیتے ہیں اس مایوسی میں صرف حمید اختر چٹان کی طرح کھڑا ہے۔ لدھیانے سے لاہور تک انسانی خون کی کئی ندیاں عبور کرنے کے باوجود اس نے اپنا ذہنی توازن نہیں کھویا۔ وہ ہماری طرح اب پلٹ کر ماضی کی طرف کبھی دیکھتا بھی نہیں بلکہ اس کی آنکھیں ہمیشہ مستقبل کی طرف گھورتی رہتی ہیں — وہ آنے والی دنیا اور آنے والے آدم کو دیکھ رہا ہے وہ کہتا

ہے" بورژوائی نظام صرف کہرا ہے، صرف دھند ہے، جو نئی دنیا کو نظروں سے اوجھل کئے ہوئے ہے۔ ہم اپنی نظروں کی گرمی سے اس دھند کو، اس کہرے کو ہٹا دیں گے ـــــ اور ہمیں ماسکو کی عمارتوں کی چھتیں، گنبد، مینار اور کنگرے نظر آئیں گے ـــــ ماسکو صرف روس کا دار الخلافہ نہیں بلکہ انسانوں کی بستی کا نام ہے، ماسکو ایک سمبل ہے!"

کبھی کبھی میں بہت اداس ہوتا ہوں تو نذیر چودھری میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتا ہے:۔

"کیا اداس بیٹھے ہو یار! زندگی گزارنی ہو تو احمد راہی کی طرح گزارو عیشاں (عیش کی پنجابی جمع) کرتا ہے پٹھا!"

اور میں سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ احمد راہی شاعر ہے دن بھر لاہور کی سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، سویرا کے دفتر میں اور ترقی پسند ادیبوں کی محفلوں میں کھوکھلے قہقہے لگاتا رہتا ہے جیسے جمہوریہ پاکستان میں شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے لئے کھوکھلے قہقہے لگانے کے سوا کوئی کام نہیں، کوئی مشغلہ نہیں، کوئی مصروفیت نہیں۔ یا جیسے پاکستان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لئے بنا ہے، فن کاروں محنت کشوں اور عام انسانوں پر پاکستان کے سارے دروازے بند ہیں!

احمد ندیم قاسمی نے ریڈیو پاکستان کی نوکری چھوڑ دی، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے ریڈیائی فیچر لکھنے بند کر دیئے۔ قتیل شفائی نے ریڈیو کا کنٹریکٹ

واپس کر دیا ——— اس لئے کہ ریڈیو پاکستان سے پاکستان کے نوابوں اور جاگیرداروں کا پروپیگنڈا ہوتا تھا ——— عبداللہ ملک نے "اخبار مہاجرین" اور طفیل احمد خاں نے ہفت روزہ "استقلال" اور "اخبار نوائے وقت" سے علیحدگی اختیار کرلی کیونکہ ان اخباروں کے صفحات کی اوٹ میں بھی جاگیردار اور سرمایہ دار چھپے ہوئے تھے۔

پھر ترقی پسند ادیب کیا کریں، ان کے اہل و عیال، ان کے متعلقین کے معاشی مسائل کس طرح حل ہوں، وہ کس طرح زندہ رہیں؟

سنا ہے ظہیر کاشمیری کو حکومت نے بڑی بڑی کرسیاں آفر کیں مگر ظہیر کاشمیری کی نظریں کھیتوں اور کارخانوں سے ہٹ نہ سکیں۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی حکومت ترقی پسند ادیب کی نظریں نہ خرید سکی، ترقی پسند ادیب کا ضمیر نہ خرید سکی، ترقی پسند ادیب کا دل نہ خرید سکی، اس کا دماغ نہ خرید سکی، اس کا قلم نہ خرید سکی!

احمد راہی کے والد نے کہا کہ گھر روپیہ نہ لاؤ گے تو پھر کیوں گھر آتے ہو۔؟"

احمد راہی رات اور راتیں گزارنے کے لئے نذیر چودھری سے "سویرا" کے دفتر کی چابی مانگ رہا ہے۔

حمید اختر کی پتلون بالکل کھسک گئی ہے۔ دوسری کوئی پتلون نہیں ——— پیسہ بھی نہیں ——— صبح صرف دو کپ چائے ہی پی تھی۔ اس کے ہونٹوں پہ بھوک سے پپیڑیاں جمی ہوئی ہیں لیکن وہ زندگی کے ترقی پسند نظریہ حیات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ہے، خالی پیٹ ہے ——— لیکن

قدم بڑے ثابت پڑ رہے ہیں۔ پیر ذرا بھی نہیں ڈگمگاتے!

احمد ندیم قاسمی جو خوش پوشی میں ضرب المثل تھا۔ پھوسڑے نکلے ہوئے کالروں کی قمیض پہنے ایک سگرٹ کے لئے بڑی دیر سے ترس رہا ہے۔

محمد صفدر کالے خاں ایم حنیف کی تار امار کہ بیڑی سلگا کر اپنی بھاری آواز میں گا رہا ہے۔

ساڈا دکھ سن من کے روندے پتھر پہاڑاں دے۔

احمد راہی فوراً اپنے دوست کے دکھ میں شریک ہو جاتا ہے۔ احمد راہی جس نے کٹڑہ سنت سنگھ امرتسر اور قرول باغ دہلی میں چار چار سو ڈنڑ پیل کر جسم کو ایک پتھر میں ڈھال لیا ہے، ایک بڑا نرم اور گداز دل رکھتا ہے، وہ جیسے دوستوں کے لئے پیدا ہوا ہے اور دوستوں کے لئے جی رہا ہے اور غالباً دوستوں کے لئے مرے گا بھی ——— دوسرے کے دکھ درد کے سامنے اس کا اپنا دکھ درد کوئی اہمیت نہیں رکھتا چنانچہ اس نے جب جنوبی ہندوستان کے باشندے ابراہیم جلیس کو پنجاب کے جاڑوں میں کپکپاتے دیکھا تو اپنا سوئیٹر اتار کر اسے دے دیا اور بولا:۔

"دوست ——— اسے تم پہن لو!"

میں ہچکچانے لگا۔ مگر اس نے کہا:۔

"شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم پاکستان کے فن کار ہیں۔ ہم ایک بورژوا دیس کے ادیب ہیں۔ کل ہمارا بھی زمانہ آئے گا اور یہاں کے بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے ہم انتقام لیں گے آج جس جاڑے میں ہم ٹھٹھر رہے ہیں

کل اسی جاڑے میں سرمایہ داری جاگیرداری اور شہنشاہیت ٹھٹھر کر مرے گی۔"
میں نے وہ سوئیٹر پہن لیا۔ حمید اختر نے کہا:
"شرمانے کی بات نہیں۔ میں آج ہی طفیل احمد خاں سے کہوں گا کہ وہ ایک مقالہ لکھیں جس کا عنوان ہو۔
"بورژوا ڈیموکریسی میں ترقی پسند ادیبوں کی معاشی حالت"
سب ہنس پڑے۔ اسی اثنا میں ریاض جاوید آگیا اور اس نے کہا:
"خوش خبری! —— خوش خبری!!"
سب متوجہ ہو گئے۔ اس نے کہا:
"مبارک ہو۔ اب لاہور میں روسی گیہوں، روسی کپڑا، روسی صابن، روسی تیل اور روسی سگرٹ آگیا ہے۔"
حمید اختر نے بے اختیار ہو کر خوشی کا اظہار کیا:
"گڈ —— ویری گڈ نیوز!"
عارف عبد المتین یا عبد المتین عارف یا عارف عبد المتین اینڈ وائس ورسا نے کہا:
"مگر تمہیں معلوم ہے کہ پاکستان کے بڑے بڑے تاجروں نے پرزور احتجاج کیا ہے کہ روسی گیہوں اور روسی کپڑے کے آجانے کے باعث پاکستان میں کمیونزم پھیلنے کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے!"
سب قہقہے لگانے لگے مگر خبر سچی تھی اور سارے اخباروں میں چھپ چکی تھی۔

احمد راہی نے خوش ہو کر کہا:

"ویل —— اب میں روسی کپڑے کا سوٹ سلواؤں گا۔ روسی صابن سے منہ دھو کر، روسی گیہوں کی روٹی کھا کر روسی سگرٹ پیتا ہوا والگا کیفے میں بیٹھا رہا کروں گا، گڈ بائی ٹو پیراڈائیز ریستوران!"

صفدر نے کہا:

"تم پیراڈائیز ریستوران ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کو چھوڑ کر جاؤ گے تو کہاں جاؤ گے۔ تمہارے پرائیویٹ خطوط بھی تو اسی پتے پر آتے ہیں!"

احمد راہی کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ یوں کھیل جاتی ہے جیسے سنگلاخ زمین پر کوئی نہر بہہ نکلی ہو۔ لیکن نذیر چودھری احمد راہی کی طرف سے صفدر سے الجھ پڑتا ہے۔ جھگڑا بڑھنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے اور حضرت ظہیر کاشمیری آ جاتے ہیں۔ سب پر سناٹا طاری ہو جاتا ہے ان کی سنہری زلفوں، سرخ چہرے خمیدہ ناک، شیکسپیرین سرخ داڑھی اور سفید دھاریوں والے ڈارک بلو سوٹ سے ترقی پسند ادب اگلنے لگتا ہے اور وہ گرج دار آواز میں گرجنا شروع ہو جاتے ہیں:

"آج ارضِ تلنگانہ کے گوشے گوشے میں کمیون بننے لگے
آج خاکستر زندگی سے وہاں زندگی کے ہیولے ابھرنے لگے
آج مردِ تلنگانہ نیرنگ فتحِ محبت دکھانے لگا
آج مردِ تلنگانہ تجدیدِ مشرق کا مژدہ سنانے لگا

آج مرد ملنگا نہ یونان و جادا سے بیدر کے رشتے ملانے لگا۔

اور چائے آجاتی ہے۔ تجویز پیش ہوتی ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کا ایک ایسا گروپ فوٹو لیا جائے جس میں ادیبوں کے عکس کے علاوہ ان کی معاشی زبوں حالی بھی تصویر میں صاف نظر آنے لگے تاکہ یہ گروپ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں لگایا جا سکے ——— مگر احمدؔ راہی مشورہ دیتا ہے کہ ظہیر کاشمیری کا فوٹو گروپ سے الگ ہو۔

ابن انشا مشورے میں اصلاح دیتا ہے:

"یہ ہونا چاہیئے کہ ظہیر کاشمیری اور ولیم شیکسپیئر کی تصویر ایک ہی صفحہ پہ چھاپی جائے اور نیچے یہ لکھا جائے:

ادھر آتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ جاتا ہے

احمدؔ راہی پھر کہتا ہے:

"ظہیر کاشمیری کی تصویر کوئی کیمرہ نہیں کھینچ سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی ایسا کیمرہ نہیں جو ٹکٹکی کا تصویر کھینچ سکے۔

ظہیر کاشمیری جلال میں آکر راہی پہ برس پڑتا ہے:

"اس جہانِ مرغ و ماہی میں اس احمدؔ راہی کو شب آفریں سیاہی میں محبوبۂ عقل سے رخصت ہوئے مدت گزر گئی، اس لئے اب اس کی کم نگاہی کا اسے اتنا شدید گلہ ہے کہ وہ دورِ صبح گاہی کی خاطر سارے ادامر و نواہی کو بدل دینے کے لئے اپنے لاتناہی لہجے میں ہر دم واہی تباہی بکا کرتا ہے!"

اور ظہیر صاحب موڈ بدلنے کے لئے بغیر فرمائش کے اپنی تازہ نظم سنانا شروع کر دیتے ہیں:

ہی ہی، ہا ہا ——— ہو ہو، ہو ہو

نظم ختم ہو جاتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین کا غیر رسمی روزانہ اجلاس ختم ہو جاتا ہے باہر نکل کر سگرٹ جلا کر میں سوچتا ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ کیا ظہیر کاشمیری نے سچ کہا ہے؟ ——— کیا سچ مچ اس کے علاوہ پاگل خانہ کوئی نہیں؟

میں اکیلا کھڑا ہوں۔ نہیں میں اکیلا نہیں ہوں۔ بلکہ میرے ساتھ میری ایک محبوبہ بھی ہے ——— بھوک ——— بھوک جو سارے پاکستان کی جان ہے۔ آج کل میں اس کے دام عشق میں گرفتار ہوں۔ میری جیب میں صرف چھ آنے باقی ہیں جب سب چلے جاتے ہیں تو میں چپکے سے میکلوڈ روڈ کے چوراہے پر کسی کبابی خوانچے والے سے حسب معمول دو تنور کی روٹیاں اور دو کباب لے کر اخباروں میں چھپا کر اپنے کسی دوست کے گھر چلا جاتا ہوں چھپ کر روٹیاں کھاتا ہوں اور رب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ پھر منظر عام پر نمودار ہو کر سگرٹ کے کش کھینچتا ہوا مال روڈ پر یوں گھومتا ہوں جیسے ابھی فلیٹی، لورینگز، اسٹفلز یا میٹرو سے ڈنر کھا کر نکلا ہوں، ویسے فلیٹی، لورینگز، اسٹفلز یا میٹرو، پاکستان سے بہت دور واقع ہیں۔ پاکستان کا عام آدمی وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا ——— عوامی پاکستان اور میٹرو پاکستان میں کتنے روپوں کی مسافت ہے ——— میں نہیں جانتا!

مگر مہینے کے ابتدائی دنوں میں جب، ایوب احمد کرمانی کو اس کی پانچ سو روپے

تنخواہ ملتی ہے تو ہماری راتیں 'میٹرو پاکستان' میں بھی گزرتی ہیں۔ 'میٹرو پاکستان' 'ہیرامنڈی پاکستان' سے یا شاہ عالمی پاکستان' سے بالکل مختلف ہے۔ آبادی، تہذیب، سیاست اور آب و ہوا ہر لحاظ سے مختلف میٹرو پاکستان میں داخل ہوتے وقت مجھے بڑی جھجک اور بڑا احساس کمتری ہوتا ہے۔ کیونکہ میرے اکلوتے کوٹ کی کہنیاں پھٹی ہوئی ہیں اور واحد پتلون کی کریز عرصہ سے غائب ہے اور یوں میں شکل و صورت کے اعتبار سے میں نظام اسٹیٹ ریلوے کا مزدور، بند صبا چل کا سپیرا یا ہندوستان کا جاسوس نظر آتا ہوں!

'میٹرو پاکستان' بڑی رومانوی جگہ ہے۔ شاہ عالمی گیٹ یا عبداللہ ملک کے کوچہ چابک سواراں کی تنگ، پیچ دار اور بدبو دار گلیوں میں گھومتے پھرتے اچانک 'میٹرو پاکستان' میں آجانے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چین کی لڑائی اور نانکنگ کے مسمار شدہ مکانوں کے ملبے کی ''نیوز ریل'' دیکھتے دیکھتے ڈوروتھی لامار کے ساتھ کوئی 'ڈریم بو آئی لینڈز' میں پہنچ جائے!

'میٹرو پاکستان' میں خواتین اسلام رنگ برنگے غرارے اور چمکیلی شلواریں پہنے اپنے اپنے محبوبوں کے ساتھ سینے سے سینہ ملائے' ہونٹ سے ہونٹ لگائے کیبرے ناچ ناچتی ہیں اور شاہ عالمی پاکستان میں کسی بغیر برقع والی دختر پاکستان کی چوٹی کاٹنے کے لئے کوئی جوشیلا مسلمان قینچی لئے دوڑتا پھرتا ہے ـــــ اسی لئے اب شاہ عالمی پاکستان میں کوئی عورت نظر نہیں آتی۔ صرف برقعے نظر آتے ہیں ہاں البتہ کبھی کبھی انارکلی کے پر شور ہجوم میں کوئی آئینہ رو نگار اپنے سیاہ برقعے کا نقاب الٹ دیتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کعبہ پر نور

کی بارش ہو رہی ہے۔

رقص زرگری شباب پر ہے۔ جام کھنک رہے ہیں۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری میٹرو پاکستان کے فرش پر آغوش در آغوش نشے میں دھت کیبرے ناچ رہی ہے۔ لڑکھڑا رہی ہے گرنے والی ہے ——— گر جائے گی!

آہاہاہا

بیرا آر جن؟

جن آر وہسکی؟

وہسکی!

آہا ہاہا ——— آؤ، آؤ کرمانی ——— باہر نکلو۔ یہ "میٹرو پاکستان" ہمارا نہیں ہے سب فراڈ ہے، دیکھو، دیکھو اسمات کروڑ انسانوں کا خون ان کھنکتے جاموں میں بھر اجا رہا ہے۔ چند انسانوں کے لئے اتنی وسیع زندگی کو یہاں سمیٹ لیا گیا ہے اور باہر ہزاروں انسانوں پر اندھیرے اور موت کو دھکیل دیا گیا ہے۔ مجھے سنبھالو۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ لندن اور نیویارک کے قمقموں کی تیز زہریلی روشنی میں میری بصارت مر رہی ہے۔ میرا دل مر رہا ہے ——— میں گر رہا ہوں، میں مر رہا ہوں ——— مجھے نکالو یہاں سے ——— مجھے بتاؤ، مجھے بتاؤ ——— عوامی پاکستان یہاں سے کتنی دور ہے ——— کتنی دور!

ایک جلوس

"میں بھوکا ہوں"

"یار میں بھی بھوکا ہوں۔"

دونوں بھوکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چار بھوکے اور آگئے —— پھر سو بھوکے اور آگئے اور پھر ۲۹ دسمبر بھی آگئی۔

۲۹ دسمبر جسے نظام شمسی نے نہیں بلکہ ہمارے ملک، کے ہزاروں بھوکوں نے مل کر طلوع کیا تھا۔ ۲۹ دسمبر جس دن دو بھوکوں نے سرگوشی نہیں کی بلکہ ہزاروں بھوکوں نے ہم آہنگ ہو کر بلند آہنگ نعرہ لگایا:

"ہم بھوکے ہیں"

"ہمیں پیٹ بھر کر روٹی دو"

یہ نعرہ جو کئی دنوں سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا معاً جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑا۔ ہزاروں آوازوں میں سمویا ہوا یہ نعرہ جب بورژوائی شاہراہ مال روڈ کی فضاؤں میں گونجا تو میٹرو اور فلیٹی کے آرکسٹرا سہم کر رہ گئے۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں ریڈیو کے نغمے بے آواز ہو گئے۔ صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی اور وہ بھوک کی آواز تھی۔

بڑے ڈاک خانہ کا پھاٹک جو روزانہ محبت ناموں، پارسلوں اور روپیوں کے ڈھیروں کو اگلتا تھا آج سڑکوں پر بھوک انڈیل رہا ہے —— پانچ چھ سو ڈاکئے اپنی وردیوں پر بھوکا د We are hungry ، کا بیج لگائے مال روڈ پر نکل آئے تھے۔ اسی مال روڈ پر جس کے بڑے بڑے ہوٹلوں اور بلڈنگوں کے کچن کی چمنیاں دنیا کی آنکھوں میں دھواں بھر دیتی ہیں کہ یہاں کوئی بھوکا نہیں ہے۔ یا جو بھوکوں کو اپنی کالی چادر میں چھپا لیتی ہیں —— مگر ۲۹ دسمبر کو ملک کا بھوکا اسی دھوئیں کے مرغولے سے، اسی دھوئیں کی چادر سے باہر نکلا —— اپنا وجود منوانے کے لئے، اپنی چھینی ہوئی روٹی حاصل کرنے کے لئے، اپنا غصب کیا ہوا حق طلب کرنے کے لئے —— چند باورچی خانوں کا دھواں ہزاروں لاکھوں بھوکوں کو آخر کب تک چھپا سکتا ہے! اب بھوک بڑے لیڈروں کی تقریروں کا بے معنی لفظ نہیں تھی بلکہ ایک ڈاکیہ تھی۔ ایک ریلوے مزدور تھی۔ آئی۔جی آفس کا چپراسی تھی۔ ٹکسال کا مزدور تھی۔

شام ہو رہی تھی۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی شام! آسمان کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ اور مال روڈ پر ڈاکیوں کا جلوس تھا۔ فٹ پاتھوں پر دوکانوں کے برآمدوں میں بالکونیوں پر۔ ہوٹلوں کی سیڑھیوں پہ کھاتے پیتے خوش حال

لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے کہ پوسٹ مین ....

ہرا فار دی پوسٹ مین

ہو برنگس اس دی نیوز

مگر پوسٹ مین آج ایک نئی نیوز اور ایک نرالی خبر لے کے آیا تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ آج اس کے پاس آپ کا محبت نامہ، آپ کا منی آرڈر۔ آپ کا پارسل نہیں تھا۔ بلکہ اس کا اپنا "دکھ نامہ" تھا۔ اس کی اپنی چھٹی تھی۔ جو اس نے آپ کے نام ہر خوش حال آدمی کے نام، وزیر اعظم کے نام، گورنر جنرل کے نام لکھی تھی۔ آج پوسٹ مین وزیر مالیہ کو وہ چیک واپس کرنے جا رہا تھا جو فروری ۱۹۴۸ء سے ابھی تک کیش نہ ہو سکا تھا آج پوسٹ مین لاٹ صاحب کے میٹھے وعدوں کی بیرنگ چھٹی انہیں لوٹانے جا رہا تھا۔

نیلا گنبد کے چوک میں دوکانوں کے چھجوں اور فٹ پاتھوں پر تماشا کناں امیر لوگ حیرت سے اس جلوس کو دیکھ رہے تھے جیسے انہیں یقین نہ آتا ہو کہ اتنے بہت سے بھوکے اس ملک کے باشندے ہیں! یہ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے! مگر جی عشق اور بھوکا کبھی چھپائے چھپ سکتا ہے!

رتن چند روڈ اور میکلوڈ روڈ کے مقام اتصال پر چمکیلی قیمتی موٹریں محنت کش انسانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے سہم کر الٹی کھسکتی جا رہی تھیں۔ کیونکہ اب آگے ان کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

جلوس کے آگے ایک تانگے کی چھت پر مائیکروفون اور لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔ جس کے ذریعے مزدور رہنما اپنے پر جوش نعرے فضا میں بکھیرتے آگے بڑھ کر

ہر رجعت پسندی کو للکار رہے تھے کہ:

پیچھے
اور پیچھے
اور پیچھے ہٹ جاؤ
ہٹ جاؤ کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایبٹ روڈ کے چوراہے پر پولیس کا سپاہی ہاتھ پھیلائے جلوس کو راستہ دے رہا تھا پولیس کا سپاہی جو ایک ہاتھ کی جنبش سے بڑے بڑے آدمیوں اور بڑی بڑی ٹریفک کو روک سکتا تھا۔ آج چھوٹے آدمیوں کے آگے مجبوراً ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا آج اس کو جیسے بڑے آدمیوں کی چھوٹی قوت اور چھوٹے آدمیوں کی بڑی قوت کا پورا تجربہ ہو چکا تھا۔

محنت کش فاقہ کشوں کا یہ جلوس شملہ پہاڑی پر یلغار کرنے بڑھ رہا تھا آج وہ سماجی زندگی کے مصنوعی فراز اور چھوٹی اونچائی کو للکارنے بڑھ رہا تھا۔ آج وہ ان بے بنیاد اونچائیوں پر چھپے بیٹھے نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور چور بازاریوں کو سطح زمین پر اتارنے کا عزم لے کے نکلا تھا۔

شملہ پہاڑی کی دوسری طرف ڈیورنڈ روڈ سے محنت کش انسانوں کا دوسرا زبردست ریلا بہتا شور مچاتا چلا آرہا تھا —— ریلوے مزدوروں کا سیلاب —— جو زیادہ جوشیلا تھا، جو زیادہ طاقت ور تھا، جو زیادہ پرجوش تھا۔ جس کے آگے سرخ پھریرا اس کشتی کے بادبان کی طرح لہرا رہا تھا جس کشتی نے زار شاہی کو ہٹلری فسطائیت

کو اور چیانگ کائی شیک کی آمریت کو موت کی بندرگاہ پر اتار دیا تھا۔ سرخ پھریرا جو آزاد انسانیت کا پیراہن ہے، یورژوائی ماحول کی سرمئی شام اور سامراجی نظام کے سوکھے جنگل میں مشعلِ راہ کی طرح ضوفشاں تھا۔

نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مزدور جن کے ہاتھوں کی بچھائی ہوئی لوہے کی پٹریوں نے کراچی کو لاہور سے، لاہور کو پنڈی سے اور پنڈی کو پشاور سے ملا دیا تھا۔ جنہوں نے لوہے کی پٹریاں جوڑ جوڑ کر مملکت کی شہ رگ تخلیق کی تھی جنہوں نے آبادیوں کو ایک رشتہ اتحاد میں منسلک کیا تھا مگر جو اپنی ذاتی زندگی کے ویرانوں سے نجات نہ پا سکے تھے۔ جو اپنی زندگی کی پٹری نہ بچھا سکے تھے۔ جو اپنی زندگی کے ڈانڈے نہ جوڑ سکے تھے۔ آج اپنی ذاتی زندگی کے ویرانوں کو آباد کرنے اور اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی کڑیوں کو تلاش کرنے کے لئے جلوس کی شکل میں بڑھ رہے تھے۔

وہ جیالے مزدور شعلہ بہاڑیوں یعنی مصنوعی اونچائیوں کو للکار رہے تھے۔

جاگیرداری	مردہ باد
سرمایہ داری	مردہ باد
چور بازاری	مردہ باد
اینگلو امریکن سامراج	مردہ باد
پبلک سیفٹی ایکٹ	مردہ باد

گڑھی شاہو سے میو روڈ، میو روڈ سے ڈیورنڈ روڈ، ڈیورنڈ روڈ سے شعلہ پہاڑی ریلوے مزدوروں کا لشکر پرچم لہراتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

شملہ پہاڑی کے دامن میں ڈاکیوں کا جلوس ریلوے مزدوروں کے جلوس سے ملا۔ ریلوے مزدوروں کا جلوس ٹکسال مزدوروں کے جلوس سے ملا۔ اور ٹکسال مزدوروں کا جلوس آئی جی آفس کے چپراسیوں کے جلوس سے ملا ——— پھر چاروں دریاؤں کا سیلاب ایک ہو کر آگے بڑھتا گیا۔ بڑھتا چلا گیا!

محنت کش مزدور غریب اپنے نووارد مہمان "فینانس" کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق بڑے اچھے تحفے لائے تھے۔ ایک تحفہ تو وہ تصویر تھی جسے نور عالم نے بڑی محنت سے بطور خاص مسٹر فینانس ہی کے لئے بنائی تھی۔ اس تصویر میں ریلوے کا ایک مزدور ریلوے لائن پر پاؤں پھیلائے کھڑا تھا۔ اور اس نے اپنے پیٹ پر سے اپنی قمیص اس لئے پھاڑ دی تھی کہ تمہیں مجھے اور مسٹر فنانس کو دکھا دے کہ اس کا پیٹ چوری ہو گیا ہے اور اس کی جگہ ایک گڑھا باقی رہ گیا ہے ——— اسی تصویر میں اس مزدور کا چرایا ہوا پیٹ ایک بھرے ہوئے اناج کے بورے کی شکل میں ایک طرّہ باز جاگیردار کے قبضے میں تھا۔

دوسرے تحفے وہ عبرت نامے اور نعرے تھے جو پلیکارڈ کی تختیوں اور گرج دار گلوں سے نکل نکل کر دیکھنے اور سننے والے کو دکھا اور سنا رہے تھے کہ اب جاگیرداری اور سرمایہ داری کے دن پورے ہو چکے یعنی:

ہُرّا فار جاگیرداری

ہُرّا فار سرمایہ داری

تیسرے تحفے میں وہ اَن گنت بلّے تھے جن پر سرخ حروف میں لکھا تھا — ہنگری۔

چوتھا اور آخری تحفہ مزدور شاعر بالم کا وہ مدھر گیت تھا جو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے لئے ایسی میٹھی لوری تھا جس میں ایک دائمی اور ابدی نیند گھلی ہوئی ہو۔

جلوس اب لاٹ صاحب کے محل کے پھاٹک پر پہنچ گیا تھا۔ محنت کشوں کا سیلاب اب جاگیردارانہ فسطائیت کے دروازے پر دستک دینے بڑھ رہا تھا۔ جاگیردارانہ فسطائیت کے دروازے پر مسلح پولیس کا دستہ محنت کشوں کے غضب ناک سیلاب کو بند کی طرح روکے کھڑا تھا۔ مگر سیلاب کا جھاگ اور نعروں کا شور محل کی دیواروں سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔ جس قوت نے یہ محل تعمیر کیا تھا آج وہی قوت اس محل کے در و دیوار ہلا رہی تھی۔

جاگیرداری مردہ باد

اور اندر جاگیرداری کی گھگھی بندھی ہوئی تھی

پولیس راج مردہ باد

پولیس کے افسر اور سپاہی مبہوت اور خاموش اپنی موت کی بشارت سن رہے تھے۔ بہت سے غریب تماشائی جو اس جلوس میں شامل تھے شاید یہ سوچ رہے تھے کہ کیا اتنے ہزار انسانوں کی بھوک صرف لاٹ صاحب نے چرائی ہے؟ اور کیا یہ سچ ہے کہ لاٹ صاحب کے ڈائننگ ٹیبل کی ایک ایک پلیٹ میں ایک ایک سو مزدوروں کے چھینے ہوئے نوالے رکھے ہیں؟

اب بھوکے لاٹ صاحب کے ڈائننگ ہال کے قریب پہنچ گئے تھے مگر پولیس کا سپاہی لاٹ صاحب کی بھری پری پلیٹ اور بھوکے مزدور کے خالی پیٹ کے درمیان

سنگین تانے کھڑا تھا۔ اسی لئے تو بھوکے چیخ رہے تھے۔

پولیس راج مردہ باد

تاکہ پولیس کا سپاہی گر پڑے اور مزدور کے پیٹ اور لاٹ کی پلیٹ کا درمیانی فاصلہ مٹ جائے، نابود ہو جائے، معدوم ہو جائے۔

محنت کشوں کا جوش بڑھ رہا تھا۔ پولیس کے سپاہیوں کی قطاریں اپنی موت کی بشارت سن سن کر کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ اچانک ایک مجسٹریٹ مزدور راہ نماؤں کے تانگے کی طرف آیا۔

جس میں ضیاء الحق گلچیں سارے مزدوروں کی راہ نمائی کا تنہا دعوے دار بنا بیٹھا تھا۔ جوں ہی مجسٹریٹ اس کے قریب پہنچا تو اس کی قیادت کا لمحۂ آزمائش بھی آگیا۔

مجسٹریٹ کے قریب آتے ہی ضیاء الحق گلچیں کے حواس اڑ گئے۔ کیونکہ وہ مزدور نہیں تھا بلکہ کینچلی میں لپٹا ہوا سانپ تھا۔ اب اس کی کینچلی اتر گئی تھی اور وہ بدحواس ہو کر نعرے لگانے لگا۔

نعرۂ تکبیر ؟

اللہ اکبر

پاکستان

زندہ باد

قائد اعظم زندہ باد

مگر اس کے نعرے جلوس میں ایک گونج بھی پیدا نہ کر سکے۔ کیونکہ مزدوروں نے دیکھ لیا تھا کہ مجسٹریٹ ضیاء الحق گلچیں کے پاس کھڑا ہے۔ یعنی صیاد اور گلچیں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ورنہ ان بے موقع نعروں کا کیا مطلب، کیا مفہوم، کیا مقصد!!!

نعرہ تکبیر اللہ اکبر ——— اللہ یقیناً بڑا ہے۔ مگر مزدور اس جگہ اللہ کی بڑائی سے منکر ہونے نہیں آئے تھے۔ وہ پیٹ بھر روٹی مانگنے آئے تھے۔ مزدوروں کو بڑے خدا کی عظمت سے انکار نہیں تھا وہ تو دنیا کے ایک چھوٹے خدا کی بارگاہ میں اپنا رزق وصول کرنے آئے تھے۔

پاکستان زندہ باد ——— مزدور پاکستان کو زندہ رکھنے ہی کا عزم لے کے نکلے تھے لیکن گلچیں گلچیں ہی نکلا صیاد کا پرانا یار، شکاری کا دیرینہ رفیق، وہ پکار رہا تھا۔

نعرۂ تکبیر

مزدور جواب دے رہے تھے۔

پیٹ بھر کر روٹی دو۔

وہ پکار رہا تھا

پاکستان

مزدور جواب دے رہے تھے۔

جاگیرداری

مردہ باد

وہ پکار رہا تھا

قائدِ اعظم زندہ باد

مزدور جواب دے رہے تھے

مزدور راہنماؤں کو رہا کرو۔

شبیر محمد شیر کی طرح غضب ناک ہو کر تانگے کی طرف بڑھا۔ گلچیں تانگے سے اتر چکا تھا کیونکہ اس کے آقا نے مزدوروں کے ایک نمائندہ وفد کو طلب کیا تھا۔ گلچیں تنہا لاٹ صاحب کی قدم بوسی کے لئے بڑھا لیکن کامریڈ عبدالغفور جو اپنی تیز نظروں سے صیاد اور گلچیں کی سازش کو دیکھ رہا تھا دوڑا ہوا گیا اور گلچیں سٹپٹا کر رہ گیا کیونکہ کامریڈ عبدالغفور گلچیں کے ساتھ محل میں داخل ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سانپ کے ہمراہ نیولا بھی ہے۔ زہر کے ساتھ تریاق بھی ہے۔ جیسے سازش کے تعاقب میں صداقت بھی ہے۔

لاٹ صاحب کے ڈرائنگ روم میں معرکہ حق و باطل کس طرح جاری تھا باہر مزدور اس سے لاعلم تھے لیکن گلچیں کی جگہ تانگہ میں اس کا چھوٹا متخلص شوق ایڈیٹر اخبار پوسٹ مین مائیکروفون سنبھالے کھڑے مزدوروں کے آگے عام لیڈروں کی طرح اسلام کے نام سے ناجائز اور غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"نعرہ تکبیر اللہ اکبر"

ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا۔

"ہم یہاں کسی سیاسی پروپیگنڈے کے لئے نہیں آئے ہیں۔"

مزدور پوچھ رہے تھے کہ کیا پیٹ بھر روٹی مانگنا سیاسی پروپیگنڈا ہے؟"

"پاکستان ہماری خود کاشتہ حکومت ہے"

گویا "خود کاشتہ" حکومت میں بھوکا رہنا فرائضِ ضروری میں داخل ہے۔

کتنا عجیب تھا وہ گلچیں کا شوق جو جاگیردارانہ نسطائیت کی کمیں گاہ کے آگے بھوکوں کو درسِ اسلام دے رہا تھا۔ بھوکے روٹی مانگنے آئے تھے طور کا جلوہ دیکھنے نہیں آئے تھے۔ پے کمیشن کی منظور شدہ تنخواہوں کے مطالبے کے لئے گئے تھے۔ شمعِ ایمان روشن کرنے یا دینیات کا سبق پڑھنے نہیں گئے تھے۔

اور اسلام نے یا پاکستان نے پاکستانیوں سے یہ وعدہ نہیں لیا ہے کہ جب بھوک لگے تو روٹی نہ کھاؤ اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤ مزدوری کر کے اجرت نہ مانگو بلکہ طور کی تجلی دیکھو پاکستان سرزمین طور نہیں سرزمین ہمالہ ہے۔ پاکستان حوروں اور فرشتوں کی جنت نہیں انسانوں کی آبادی ہے۔

کامریڈ شیر محمد غدار لیڈروں اور مکار گلچینوں سے مائیکروفون چھین لینے کے لئے تانگہ پہ چڑھ گیا اور شوق رسوا ہو گیا۔ مگر شوق نے بھوکے مزدوروں کے جلسے میں ایک عاشقانہ غزل چھیڑ دی۔

عشق کی باتیں عشق کی گھاتیں

حالانکہ سعدی شیرازی برسوں پہلے فرما گئے ہیں ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

کامریڈ شیر محمد نے مائکروفون چھین لیا اور شیر کی طرح گرجا ——— ساتھیو!

ابھی ابھی چند سمجھ نہ باندفیانوسی اصلاح پسند لیڈروں نے ہماری منظم اور مضبوط صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے خوشی ہے کہ ہماری آہنی صفوں کو توڑا نہ جاسکا۔ ہم ریلوے مزدور، پوسٹ مین، منٹ مزدور اور چپراسی پہلے بھی ایک تھے۔ اب بھی ایک ہیں۔ آئندہ بھی ایک رہیں گے ہمارا اتحاد زندہ باد۔

اس کے بعد کامریڈ شبیر محمد نے مائیکروفون مزدوروں کے محبوب شاعر بالم کے آگے کر دیا اور بالم اپنے مست اور پرجوش لہجہ میں گیت سنانے لگا ؎

جد آن کھلے میدان دے وچہ پھر اندر ڈر کے ڈرنا کی
جد کرنا ختم امیراں نوں پھر گولیاں کولوں ڈرنا کی

مزدور اپنی نئی قوت کے نئے نغمے کو جھوم جھوم کر سن رہے تھے حتیٰ کہ وہ سی۔ آئی ڈی سوائین جو خود بھی حسب الحکم سرکارعالی (Hungry) کا بیج لگائے بھوکوں کے ہجوم میں کھڑے تھے داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک مزدور نے ایک سوائین کو پہچان کر پوچھا:

اچھا رے تو بھی بھوکا ہے کیا ——— ؟

سوائین نے دانت کھول دیئے جیسے اپنے آپ پھر نادم ہو کہ کاش وہ سی۔ آئی ڈی کے بجائے اس جیالے مزدور کی طرح بھوکا ہی ہوتا ہے۔ !

مزدور نے پوچھا:

ہمارے جلوس میں کتنے مرگے بلہ لگا کر بھوکے بن گئے ہیں ؟"

سوائین نے جو صرف چالیس روپے ماہوار کے عوض سچائی کو چھپانے کی

قوت نہیں رکھتا تھا بولا:

بہت سے حرام ....

پھر وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی گویا سمجھنے والوں کو سمجھا رہی ہو کہ موقع نہ ملا۔ ورنہ ہمارے افسر بھی یہ بلّا لگا کر بھبہ کے بن جاتے۔ اور کیا پتہ ہمارے لاٹ صاحب کو بھی یہ بلّا لگانے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر ہائے ہائے موقع ہی نہ ملا۔

x x x x

محل کے اندر معرکہ حق و باطل ختم ہو چکا تھا۔ اور باہر کامریڈ بالم کا جوشیلا گیت ختم گیا تھا۔ گل چیں اور کامریڈ عبدالغفور باہر نکلے۔ سانپ اور نیولا پھر نمودار ہوئے۔ گل چیں نے مائیکروفون سنبھالا۔ اور دم ہلانے لگا یعنی تقریر کرنے لگا۔

"ساتھیو ہمارے لاٹ صاحب نے بہ کمال شفقت وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ہمارے مطالبات پر غور کریں گے۔ ہمارے لاٹ صاحب نے آپ کے دکھوں پر ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔"

مگر مزدور غضب ناک نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں —— تم روٹی لانے اندر گئے تھے یا اپنے لاٹ صاحب کی شفقت لانے —— تم پے کمیشن کا اعلان مانگنے گئے تھے یا لاٹ صاحب سے پیار اور اخلاص بڑھانے!

کامریڈ عبدالغفور کو غصہ آگیا۔ نیولے نے سانپ کو ہڑپ کر لیا اور مائیکروفون کامریڈ غفور کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نہایت بے باکی سے ہجوم میں بلند ہو کر محل کے سامنے

لاٹ پولیس کے آگے سینہ تان کر کہنا شروع کیا:

ساتھیو! یہ سب جھوٹ ہے۔ اندر جو کھیل کھیلا گیا وہ کچھ اور تھا۔ اندر جو گول مول باتیں ہوئی ہیں اس کو بتانے کے لئے میں یہاں کھڑا ہوں.........

مگر گل چیں نے تانگہ دوڑانا شروع کر دیا اور نعرۂ تکبیر کے زور سے چند ایک ڈاکیوں کو بھی ساتھ لے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر بھی ڈاکیوں کی بہت بڑی تعداد کامریڈ غفور کے گرد کھڑی تھی اور بڈھا کہہ اپنے دم ہلانے والے رہنما کو بڑی بڑی گالیاں دے رہے تھے۔ کامریڈ غفور نے اعلان کیا:

میں اپنے سارے ساتھیوں، ریلوے مزدوروں، ڈاکیوں اور چپراسیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ تفصیل سننے کے لئے یونین کے دفتر چلیں ——

جلوس لوٹنے لگا۔ اب جلوس بہت غضب ناک تھا۔ اب آوازیں اور بھی گرج دار ہو گئی تھیں۔ اب نعرے اور بھی غصیلے ہو گئے تھے۔

کلوٹے کتا —— ہائے ہائے

پلپلے گنجر —— ہائے ہائے

جوتی چور —— ہائے ہائے

گڑھی شاہو کی سڑک کے موڑ پر ایک کھلی سی جگہ پر جلوس رک گیا۔ مزدور لیڈر نے لاٹ صاحب کی ملاقات پر مفصل تقریر کی اور بتایا کہ کس طرح غریب مزدوروں کے خلاف سٹھ بازی اور سازشوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں —— تقریر کے بعد موقع پرست لیڈرشپ کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا، مزدوروں سے اتحاد، تنظیم اور بھائی چارگی کی اپیل کی گئی اور

جلوس منتشر ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سڑک سنسان پڑی تھی۔ شملہ پہاڑی اپنے اندھیرے میں آپ ڈوب گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے سارے مزدوروں نے لاٹ صاحب کے میٹھے وعدوں اور پُرشفقت کھوکھلی ہمدردی کو ہضم کر لیا ہو گا۔ اور ان کی بھوک اور بڑھ گئی ہو گی۔

دوسرے روز ہزاروں مزدوروں کے دو میل لمبے جلوس کی خبر اخبارات میں صرف چار سطروں میں چھپی مگر افق پر مستقبل ان کی ایک تاریخ مرتب کر رہا ہے۔

پرمٹ

پاکستان اور ہندوستان کے دو لیڈروں کی انگریزی تقریروں کا ترجمہ کرنے کے بعد جمیل جب اخبار کے دفتر سے باہر نکلا تو رات آدھی سے بھی زیادہ گزر چکی تھی۔ ایبٹ روڈ سنسان تھی۔ ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سارے گھروں میں روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ البتہ سڑک کے کنارے کنارے بجلی کے کھمبوں کی ایک روشن قطار سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سڑک بھی کسی لیڈر کی تقریر ہے جس میں سناٹا بھی ہے، اندھیرا بھی ہے اور کہیں کہیں بجلی کا جلتا ہوا قمقمہ۔

ہر چالیس پچاس قدم کے بعد بجلی کا ایک کھمبا جمیل کے قریب آتا۔ ایک لمحے کے لئے رک کر جمیل کو غور سے دیکھتا اور چپ چاپ پیچھے گزر جاتا۔ جیسے اس کی سنسان اور اندھیرے اجالے میں گڈمڈ زندگی میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد فاطمہ کا چہرہ جگمگاتا ہے، چھپ جاتا ہے، چھپ جاتا

ہے اور جگمگاتا ہے۔ قمقمے پھر قریب آتے ہیں۔ شہریار، زویا، لی لی اور افتخار کے بھولے بھالے معصوم چہرے دمکتے ہیں، مسکراتے ہیں۔ مسکراتے ہیں، غائب ہو جاتے ہیں۔ غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر مسکرانے لگتے ہیں۔

ایبٹ روڈ گھوم کر میکلوڈ روڈ میں جا ملی۔ میکلوڈ روڈ بھی سنسان تھی۔ بجلی کے قمقمے، بونے، چار ننھے بچوں، گیارہ بھائیوں، ایک ماں، ایک باپ کے محبت بھرے چہرے جلتے بجھتے چلے جا رہے تھے۔ سایہ کبھی آگے کبھی پیچھے —— دکھ کبھی زیادہ کبھی کم —— اور سڑک ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔ بچپن۔ لڑکپن۔ جوانی۔ ایبٹ روڈ، میکلوڈ روڈ۔ مال روڈ اور پرانی انارکلی تک سناٹا ہی سناٹا اور اندھیرے اجالے میں گڈمڈ ایک زندگی، ایک لمبی سڑک ——

گھر بہت دور ہے، بہت دور —— سڑک ادھر واگہ تک اور ادھر کراچی کے ساحل پر ختم ہو جاتی ہے اور گھر دور ہے، ہزاروں میل دور..........

اندھیرے مکانوں کی دو رویہ قطاریں لمبی ہی لمبی چلی گئی تھیں۔ جمیل نے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر بتی جلی، روشنی وینٹی لیٹرز کے شیشوں پر پھیل گئی، دروازہ کھلا، دروازہ فاطمہ نے نہیں بلکہ حامد نے کھولا۔ حامد —— جمیل کا دوست، جمیل کا میزبان۔

حامد نے نیند بھری آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا:

"کیوں بھئی بہت دیر کر دی؟"

جمیل نے کہا:

"یار میں نے سنا ہے کہ لاہور اور امرتسر کے درمیان ریل چلنے والی ہے۔ آج اسٹیٹس مین نے بھی انٹرڈومینین ٹریول پر ایک اداریہ لکھا ہے۔"

حامد نے کہا:

"اس سے کیا ہوتا ہے پرمٹ سسٹم تو برابر رہے گا دو آزاد ملکوں کے درمیان......"

جمیل نے بھرے ہوئے لہجے میں پوچھا:

"تو پھر میری بیوی، میرے بچے، اور میرے........"

حامد نے مسکراتے ہوئے بتی بجھا دی۔

اندھیرا

جمیل بستر پر لیٹ گیا۔ سو گیا یا جاگتا رہا؟؟ ویسے اندھیرے میں تو آدمی سوچتا ہے یا پھر وہ سوئے یا نہ سوئے بظاہر تو اندھیرا نیند کا دوسرا نام ہے۔

جمیل پھر چلنے لگا۔ پرانی انارکلی سے میکلوڈ روڈ، میکلوڈ روڈ سے لاہور اسٹیشن۔ لاہور اسٹیشن سے کراچی کی بندرگاہ، بمبئی کی بندرگاہ، بوری بندر اسٹیشن، نام پلی اسٹیشن، فتح میدان، بشیر باغ، حیدر گوڑہ۔

جمیل نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ حامد نے نہیں بلکہ فاطمہ نے کھولا۔ فاطمہ ـــــ جمیل کی بیوی، جمیل کی محبت....

فاطمہ نے نیند بھری آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا:

"کیوں جی۔ بہت دیر کر دی؟"

جمیل نے جواب دیا:

"میں نے سنا ہے کہ لاہور اور امرتسر کے درمیان ریل چلنے والی ہے آج "اسٹیٹس مین" نے بھی انٹرڈومینین ٹراویل پر ایک اداریہ لکھا ہے۔"

فاطمہ نے پوچھا:

"مگر پرمٹ ——— ؟؟"

جمیل بپھر گیا۔ اور وہ کچھ سخت جواب دینا چاہتا تھا مگر ....

اجالا

حامد نے جمیل کو جگا دیا تھا۔ جمیل بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جاگتا رہا۔ سوتا رہا ——— ؟؟ ویسے اجالے میں تو آدمی جاگ پڑتا ہے۔ یا پھر وہ جاگے یا نہ جاگے بظاہر تو اجالا بیداری کا دوسرا نام ہے۔

اسی طرح سوتے جاگتے چار مہینے گزر گئے، نومبر دسمبر جنوری اور فروری، کڑکڑاتے جاڑے کی ساری لمبی راتیں تہی آغوش گزر گئیں۔ جمیل صرف خوابوں کے جال بنتا رہا۔ ہر رات ——— ہر رات یہی ہوتا رہا۔ جمیل آنکھ لگتے ہی ہندوستان چلا جاتا اور آنکھ کھلتے ہی پاکستان لوٹ آتا۔ اور یہ سب کچھ ہوا ابھی چشم زدن میں ———

وہ ہندوستان بنا

اور یہ پاکستان بنا

اور فاطمہ جو سات سال پہلے خواب کی عورت تھی پھر اسی پرانے خواب میں واپس چلی گئی۔

سات سال پہلے جمیل فاطمہ کو اپنے ایک خواب ہی سے اغوا کر کے زمین پر لایا تھا۔ حاجی حیدر بلڈنگ سے پھولوں سے لدی سرخ رنگ کی ایک کار میں بٹھا کر اقبال منزل جگجت اسٹریٹ گلبرگہ کے ایک جگمگاتے معطر سجے سجائے کمرے میں لے آیا تھا۔ جہاں جمیل کی ماں مرحوم بہن اور گلبرگہ شہر کی بہت سی عورتوں نے اس کے سرخ گھونگھٹ کو الٹ کر اس کا نمکین پیارا پیارا چہرہ اس کی ٹیڑھی ٹیڑھی بادام جیسی آنکھیں اور اس کی جھومر سے جگمگاتی پیشانی دیکھی تھی اور باہر گھر کے بڑے دروازے پر نفیریاں،

باجے، ڈھول اور تاشے بج رہے تھے۔

پھر زندگی میں فاطمہ کے چہرے کی چمک اس کے جسم کی مہک اور اس کی ساڑیوں، شلواروں اور دوپٹوں کے رنگ ہی رنگ بھر گئے۔ زندگی گویا سمٹ سمٹا کر ایک عورت کے جسم میں آ گئی ———— فاطمہ کا جسم زندگی کا جسم تھا۔ زندگی کا جسم۔ جس سے چار اور زندگیوں کی کونپلیں پھوٹیں اور پانچویں زندگی کی کونپل ابھی پھوٹنے ہی والی تھی کہ گھر کے باہر سڑک پر ایک شور مچ گیا۔ سڑک پر فوج تھی، سڑک پر غنڈے تھے۔ سڑک پر ہندو اور مسلمان تھے، سڑک پر لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ سڑک پر انسان کا خون بہہ رہا تھا۔

جمیل ریڈیو اسٹیشن سے گھر لوٹ رہا تھا۔ ریڈیو کے محکمے کا ایک غریب مسودہ نگار۔ اس کے پیچھے فوج کے سپاہی اور غنڈے دوڑے ———— "یہ قاتل ہے۔ یہی قاتل ہے۔ پکڑو۔ مارو۔"

جمیل چیختا ہوا دوڑنے لگا۔ "نہیں نہیں میں قاتل نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب مسودہ نگار ہوں۔ مجھے نہ پکڑو۔ مجھے مت مارو۔ میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں قاسم رضوی نہیں ہوں۔ میں ایک غریب مسودہ نگار.......... میرے اللہ!!"

"تمہارا اللہ پاکستان چلا گیا۔" کوئی آواز آئی۔

جمیل گھر کی دہلیز پر گر کر پکارنے لگا۔ "فاطمہ چلو ———— جلدی چلو۔ بچوں کو اٹھاؤ۔ پاکستان چلو۔ سب پاکستان جا رہے ہیں کیونکہ اللہ بھی پاکستان چلا گیا ہے۔ بابا ———— بابا چلو جلدی چلو۔"

جمیل کے باپ نے کہا:

"وہ کیسے جا سکتی ہے۔ تم دیکھتے نہیں کہ وہ حام.........."

اور بوڑھا باپ رونے لگا:

"تم جاؤ میرے بچے۔ میں اسے ساتھ لے کر آجاؤں گا۔ تم جاؤ ورنہ یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے تم جاؤ۔ تم زندہ رہو۔ تم ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو میرے بچے........"

آوازیں قریب آرہی تھیں۔ "یہ قاتل ہے۔ پکڑو۔ مارو۔"

جمیل اٹھا اور دوڑنے لگا۔ اندھا دھند۔ کیوں کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھائی ہوئی تھی۔

اور جب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھند چھٹ گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے فریئر روڈ کراچی کے ایک چائے خانے میں قائد اعظم کی قدِ آدم تصویر دیکھی۔ اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کہ ــــ پاکستان خواب نہیں حقیقت ہے، اور یہ سب کچھ ہوا بھی چشم زدن میں۔

وہ ہندوستان بنا

اور یہ پاکستان بنا

اور فاطمہ جو سات سال پہلے خواب کی عورت تھی پھر اسی پرانے خواب میں واپس چلی گئی۔

جمیل اس پرانے خواب سے فاطمہ کا دوبارہ اغوا کرنا چاہتا تھا لیکن اب حیدر بلڈنگ اور اقبال منزل دونوں مسمار ہو چکے تھے۔ اب پھول مرجھا گئے تھے۔ سرخ گھونگھٹ جل رہا تھا اور باہر گھر کے بڑے دروازے پر نفیریاں، باجے، ڈھول اور تاشے بجانے والے مرے پڑے تھے۔ البتہ ایک ڈراؤنا بھیانک نغمہ گونج رہا تھا۔ جو انسان کی موت پر جاگتا ہے، بلند ہوتا ہے۔ گونجتا ہے۔

جمیل نے سات سال پرانے خواب کے کواڑ پھر کھٹکھٹائے۔ اس نے فاطمہ کو خط لکھا۔

"میری پیاری فاطمہ میری جان فاطمہ .... گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں بہت جلد بلا دوں گا

تمہارا سہاگ میرے پاس موجود ہے۔ یہ جدائی کے دن کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائیں گے۔ اور اب تو کشمیر کی لڑائی بھی رک گئی۔ اب ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اچھے ہو رہے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ لاہور اور امرتسر کے درمیان پہلی تاریخ سے ریل چلنی شروع ہو جائے گی۔ تم فکر نہ کرو میں نے یہاں ایک بہت بڑا مکان کرائے پر لے لیا ہے ایک باورچن بھی نوکر رکھی ہے اب تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مجھے یہاں ایک اچھی سی نوکری بھی مل گئی ہے۔ شہریار، زویا، لی لی، افتخار اور آنے والے بچے کو میری طرف سے جی بھر کے پیار کرو۔ اور اس خط کا جواب فوراً دو۔ ہمیشہ ہمیشہ تمہارا ...."

بڑے ڈاک خانے کے ایئر میل لیٹر بکس میں خط پوسٹ کر کے وہ بی بی برکتے کے تنور پر چلا گیا جہاں حامد بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے گھر کی چابی جمیل کے پاس تھی وہی بہت بڑا مکان جس کو جمیل نے کرایہ پر لے رکھا تھا اور وہی بی بی برکتے جو جمیل کی باورچن تھی اور روٹی کھانے کے بعد جمیل اس کی جھریوں بھری ہتھیلی پر آٹھ آنے۔ دس آنے۔ بارہ آنے رکھ دیا کرتا تھا۔

پانچ چھ دن بعد حامد کچھ پریشان سا جمیل کی تلاش میں بی بی برکتے کے تنور پر پہنچا۔ تو وہاں جمیل بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ حامد کو کچھ پریشان سا دیکھ کر جمیل نے پوچھا:

"کیا بات ہے دوست تم کچھ اداس ہو؟"

حامد نے کہا:

"ہاں ـــــ ابھی ابھی تمہارا ہی ذکر آیا تھا۔ وہ امتیاز ہے نا۔ وہ ملا تھا۔ اس کی سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک انسپکٹر سے بڑی دوستی ہے۔ اس انسپکٹر نے امتیاز کو بتایا کہ تم نے کوئی خط ہندوستان کو لکھا ہے۔"

جمیل نے پوچھا:

"کیوں ———؟ میں تو ہندوستان کو روز ایک خط لکھتا ہوں وہاں میری بیوی ہے، میرے بچے ہیں۔ میرے ماں باپ بھائی، میرا گھر میرا سب کچھ ابھی وہیں ہے۔ وہاں سے صرف میں آسکا ہوں۔"

حامد نے کہا:

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ مگر کوئی ایسی ویسی بات نہ لکھا کرو تو اچھا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو خط سنسر ہو جاتے ہیں۔"

جمیل نے بگڑ کر پوچھا:

"تو کیا ماؤنٹ بیٹن پلان کی کوئی شرط یہ بھی تھی کہ میاں بیوی کو، بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو خط نہ لکھ سکے ——— اور....... اور یہ کہاں کی شرافت ہے کہ کسی کے ذاتی خطوط کھول کر پڑھ لئے جائیں۔ کیا آزاد ملکوں میں بھی........"

حامد نے کہا:

"ذرا دھیمے لہجے میں بات کرو۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک تنور ہے۔ اچھا بات نہ کرو۔ روٹی کھاؤ۔"

روٹی جمیل کو کھانے لگی۔

پھر کچھ دنوں بعد فاطمہ کا ایک محبت نامہ جمیل کو ملا۔ فاطمہ نے لکھا تھا کہ آپ کچھ دنوں کے لئے خطوط نہ لکھئے۔ کیونکہ یہاں جس کے پاس پاکستان سے خط آتا ہے۔ اس کو پاکستان کا جاسوس سمجھا جاتا ہے۔ کل پولیس والے ابا جان کو اسی لئے تھانہ پہ لے گئے تھے کہ ان کے

گھر پاکستان سے خطوط آتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم سب وہاں بہت جلد آ رہے ہیں۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ بغیر پرمٹ کے وہاں نہیں آ سکتے۔ اگر آپ وہاں سے پرمٹ بھجوانے کا انتظام کریں تو اچھا رہے گا۔ فاروق میاں کے چچا نے کراچی سے اپنے سارے خاندان والوں کے لئے پرمٹ بھجوایا تھا۔ چنانچہ کل شام کی گاڑی سے وہ سب لوگ کراچی چلے گئے۔ سنا ہے کہ بمبئی میں پرمٹ ملنا بہت مشکل ہے ——— باقی سب خیریت ہے۔ شہریار اب سکول جانے لگا ہے۔ زویا اور لی لی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ افتخار رینگ رینگ کر چلنا سیکھ رہا ہے۔ میری طرف سے آپ کو بہت بہت پیار۔ فقط

آپ کی ....

نوٹ: پرمٹ ضرور بضرور بھجوایئے۔

خط پڑھ کر جمیل کو بڑا غصہ آیا۔ اور فاطمہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے خط کا جواب لکھا اور کرشن نگر کے بس اسٹاپ سے دو نمبر کی بس میں چڑھ گیا کہ فوراً بڑے ڈاک خانے جائے اور خط پوسٹ کر دے۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور بس میں بڑی گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ بات راشن کے غلے سے شروع ہو کر پبلک سروس کمیشن کی سفارشات تک پہنچ گئی تھی کہ ایک پنجابی اور ایک دہلی کے مہاجر کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دہلی کا مہاجر بول رہا تھا۔

"اگر ہمیں پہلے ہی معلوم ہوتا کہ پاکستان آ کر بھی ہماری قسمت میں روز روز کا مرنا ہی لکھا ہے تو ہم وہیں کافروں کے ہاتھوں شہید ہونے کو ترجیح دیتے۔"

اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک سوٹڈ بوٹڈ اور طرہ باز پگڑی اور بڑی بڑی مونچھوں والے خان صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے کہا: "جناب عالی کسی نے آپ کی

خوشامد تو نہیں کی تھی کہ آپ یہاں تشریف لائیے۔

ایک سفید ریش صلح پسند بزرگ جن کی بغل میں اخبارات کا ایک پلندہ تھا بولے:

"ارے بھائیو اس میں جھگڑنے کی بات ہی کیا ہے ابھی تو پاکستان بنے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ تکلیفیں تو بہر حال اٹھانی چاہئیں۔ بغیر ایثار اور قربانی کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔"

ایک نوجوان لڑکا جو شاید سفید ریش صلح پسند بزرگ سے واقف تھا بولا:

"قبلہ درست فرمایا آپ نے۔ مگر قوم تو قربانی اور ایثار برابر کر رہی ہے۔ آپ کے آزاد ملک کا عام آدمی تو آدھا پیٹ راشن کھاتا ہے۔ بھوک سے مرتا ہے۔ ملیریا سے مرتا ہے۔ مکان کا کرایہ ادا نہ کرنے کی صورت میں فٹ پاتھ پر مرتا ہے۔ روز روز مرتا ہے۔ وہ آپ جیسا خوش قسمت کہاں کہ پریس بھی الاٹ کرالے۔ کوٹھی بھی الاٹ کرالے۔"

جمیل سے نہ رہا گیا اور وہ گفتگو کے بیچ ٹپک پڑا۔

"اور جناب آزاد ملک کا آزاد باشندہ اپنی بیوی کو خط لکھتا ہے تو گورنمنٹ پہلے پڑھتی ہے۔ میری جائز منکوحہ بیوی مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ پرمٹ طلب کرتی ہے۔ میں یہاں ففتھ کالم ہوں اور وہ بے چاری وہاں پاکستان کی جاسوس ہے۔ آپ تو غالباً بغیر پرمٹ کے اپنی بیوی کے پاس جاتے ہیں۔"

بعض لوگ ہنسنے لگے۔ بزرگ جلال میں آگئے۔ ان کے ساتھ چند اصلی اور چند نو وارد پاکستانی بھی جمیل اور اس نوجوان لڑکے سے لڑنے کھڑے ہو گئے۔ مگر ڈاک خانے کا اسٹاپ آگیا۔ اور جمیل اتر گیا۔

جمیل نے خط پوسٹ کیا۔ خط جس کو پہلے گورنمنٹ پڑھے گی بعد میں فاطمہ پڑھے گی۔

خط پوسٹ کر کے جب وہ خبروں کا ترجمہ کرنے اخبار کے دفتر گیا تو اس کی میز پر ایک خط رکھا ہوا تھا۔ فاطمہ کا خط۔ جسے گورنمنٹ نے پڑھ لیا تھا اور اب جمیل پڑھ رہا تھا——"

"پیارے جمیل۔ ہم لوگ گذشتہ آٹھ روز سے بمبئی میں ہیں۔ محمد علی روڈ پر عبدالستار کی سرائے میں ٹھیرے ہیں۔ پرمٹ نہیں مل رہا ہے۔ باباجان بہت پریشان ہیں۔ ہم جتنا اثاثہ لے کر نکلے تھے وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ زو آپا کو بھی یہاں آکر بخار ہو گیا ہے پریشانی ہی پریشانی ہے۔ اس خط کو تار سمجھو اور فوراً ہوائی ڈاک سے خط بھیجو ہرگز دیر نہ کرنا۔

صرف تمہاری . . . .

خط پڑھ کر جمیل کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سامنے دیوار پر آویزاں اس تصویر کو غور سے دیکھنے لگا جس میں ایک بہت بڑے راہ نما اپنی بیگم کے پہلو بہ پہلو کھڑے مسکرا رہے تھے ×

سکینہ زوجہ.....

باہر چاندنی چوک میں موت ٹہل رہی تھی

بھاگنے کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اور میں "محبوب ہوٹل" میں یکہ وتنہا رہ گیا تھا۔ سارے مسافر، نوکر چاکر، حتیٰ کہ منیجر اور مالک بھی بھاگ گئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہوٹل بالکل میری اپنی ملکیت ہے۔ میں کچھ حیران، تھوڑا سا خوش اور بہت زیادہ گھبرایا ہوا بھی تھا۔

باہر چاندنی چوک میں موت ٹہل رہی تھی۔ میں کھڑکی کے بند شیشوں سے جھانک کر اسے بڑی ڈری سہمی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ٹہلتے ٹہلتے جانے کب "محبوب ہوٹل" میں گھس پڑے اور یہ ہوٹل جو مجھ ازلی مفلس اور تباہ حال پردیسی مسافر کی جو آگے کے سفر کے خطرے سے ڈر کر اس ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا ——— ابھی ابھی ملکیت بن گیا تھا ——— ابھی ابھی مجھ سے

ہمیشہ کے لئے چھن جائے گا ——— دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ موت کسی طرح چاندنی چوک سے ٹل جائے۔ جھگڑے فساد ایک دم بند ہو جائیں یکایک امن و امان بحال ہو..........

کیونکہ ایک جما جمایا، خوب چلنے والا ہوٹل مجھے مفت مل گیا ہے

میں نے "اپنے ہوٹل" کا ہر کمرہ کھول کر دیکھا۔ توبہ توبہ یہ مسافر لوگ بھی کتنے گندے ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ پان کی پیک۔ سگرٹوں کے ٹکڑے، ردی کاغذ کے پرزے ——— صفائی کا خود خیال نہیں رکھتے، ہوٹلوں کی صفائی پر بڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مگر میں اپنے ہوٹل میں ایسے بدتمیز گندے مسافروں کو ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کروں گا۔ اپنے ہوٹل کو بالکل انگریزی ہوٹلوں کی طرح سجا دوں گا۔ سنواروں گا۔ اس کی خوب تشہیر کروں گا۔ اخباروں میں روز نئے نئے طریقے سے اشتہارات چھپواؤں گا۔ شہر کے سارے سینماؤں میں اس کے سلائیڈ دکھاؤں گا۔ ریلوے اسٹیشن، ایروڈروم اور لاریوں کے اڈے پر اس کے بڑے مہذب، پڑھے لکھے اور چرب زبان ایجنٹ بھیجوں گا ——— اس کا نام ——— ؟ اس کا نام بھی بدل دوں گا۔ یہ محبوب ہوٹل کیا نام ہوا بھلا؟ بالکل بھٹیار خانے جیسا نام ——— اس کا کوئی بڑا ہی رومانٹک جدت آفریں اور تاریخی نام رکھوں گا۔ جو سارے ہندوستان کی رومانیت، تہذیب اور تاریخ کا سمبل ہو ——— بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے نام بھی تجویز کر لیا۔

ریڈ فورٹ ہوٹل..........

ریڈ فورٹ ہوٹل جب چل نکلے گا۔ خوب مشہور ہو گا۔ اور لوگ برتنوں میں جھوٹا

چھوڑنے کے بجائے چاندی چھوڑ جایا کریں گے ——— تب میں نئی دہلی کی ایک شاندار کوٹھی خریدوں گا۔ کسی بڑے آدمی کی سرخ وسفید رنگ کی نازک سی لڑکی سے شادی کروں گا اور ہر شام اپنی بیوی کو پہلو میں بٹھا کر اپنی شاندار چمکیلی کار خود ڈرائیو کرتا ہوا اپنے ریڈ فورٹ ہوٹل ....

اچانک کسی نے ریڈ فورٹ ہوٹل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

موت ——— ؟

شہاب الدین۔ او شہاب الدین دروازہ کھولو

انسان ——— !

میں علی محمدؐ ہوں ——— علی محمدؐ ——— دروازہ کھولو ——— جلدی

علی محمدؐ ——— !

میں علی محمدؐ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ علی محمدؐ مالک دی ہیر کٹنگ سیلون۔ محبوب ہوٹل کے بالکل پہلو میں اس کا ہیر کٹنگ سیلون اور گرم شاہی حمام تھا۔ محبوب ہوٹل کے سارے مسافر اسی کے ہاں شیو بنواتے تھے اور بعض رنگیلے مسافر تو ہوٹل میں نہانے کی بجائے اسی کے گرم شاہی حمام میں نہاتے تھے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا علی محمدؐ اور اس کی بیوی جس کی گود میں ایک چار ماہ کا بچہ تھا۔ جھپاک سے اندر داخل ہوئے اور خود ہی اندر سے دروازے کو کنڈی لگا دی۔

علی محمدؐ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

بابو جی ——— آپ یہاں اکیلے ہیں؟ اس کا مینیجر شہاب الدین وہ کہاں گیا

بھاگ گیا ——— ؟ بیرے بھی بھاگ گئے؟ اف ——— افوہ ۔ ہائے بابوجی ۔ سب تباہ ہو گیا ۔ سب لٹ گیا ——— بڑی مشکل سے ہم دونوں یہاں تک ۔ جان بچا کر پہنچے ہیں ۔ اللہ جانے ——— اب کیا ہو گا ——— اے مولا پروردگار !!

ایک لمحے کے لئے تو مجھے اس منحوس پر بڑا غصہ آیا ۔ جس نے اپنے بھاری بھرکم پیروں سے میرا ریڈ فورٹ ہوٹل مسمار کر ڈالا تھا ۔ مگر اس کی بیوی بڑی قبول صورت تھی ۔ جوان بھی تھی ۔ افسوس ہوتا تھا کہ علی محمد بھی اس کے ساتھ چلا آیا ۔ کاش یہ اکیلی آجاتی ۔ اس گڑبڑ میں ریڈ فورٹ ہوٹل کی طرح ایک خوب صورت عورت بھی مفت مل جاتی ۔ ایسی گڑبڑ ہمیشہ تو نہیں ہوتی ۔ ایسے سنہرے موقعے ہمیشہ تو نہیں آتے ——— مگر فوراً میرے دل میں وہ شریف زادہ ضمیر بکواس کرنے لگا کہ تم میں اور ایک عام غنڈے میں کیا فرق ہے؟ جو موت اور تباہی اور انسانی لاشوں کے درمیان اپنا ریڈ فورٹ ہوٹل تعمیر کر رہا ہے اور عورت کو گرائے ہوئے ہے ——— وہ یوں ہی مجھے ڈانٹ رہا تھا" جیسے میں کوئی لیڈر ہوں کوئی بڑا سرمایہ دار ہوں ۔

علی محمد کی بیوی کی گود میں بچہ رونے لگا ۔ علی محمد غصے سے چیخ پڑا ۔

"سکینہ ——— اس کا گلا گھونٹ دے ۔ باہر آواز جائے گی تو غنڈے ادھر بھی آجائیں گے اور ہم سب مارے جائیں گے ۔"

سارے رشتے مر چکے تھے اور رشتوں کی لاشوں پہ باپ بھی پڑا مر رہا تھا ۔ صرف علی محمد غرا رہا تھا ۔

"میں کہتا ہوں حرامزادی ۔ گلا گھونٹ دے اس کتے کے پلّے کا ۔"

سکینہ نے قمیض کا دامن اٹھا کر بچہ کے منہ میں چھاتی دے کر گلا گھونٹ دیا۔ مگر شاید چھاتی بھی سوکھ چکی تھی۔ بچہ برابر روئے جا رہا تھا۔ اور باہر موت ٹہل رہی تھی۔

ہوٹل کا دروازہ پھر کھڑکھڑانے لگا۔

موت ——؟

دروازہ مت کھولو

دروازہ نہیں کھلا۔

دروازہ جلنے لگا۔

میں علی محمد اور سکینہ چھت کی طرف دوڑے۔ چھت گویا سڑک بنی ہوئی تھی ہماری طرح اور دس پندرہ آدمی پیٹ کے بل رینگتے دوسری طرف جا رہے تھے۔ میں نے چھت پر سے جھانک کر آخری بار اپنے ریڈ فورٹ ہوٹل کو دیکھا۔ اسے چھوڑتے ہوئے بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ کتنے طویل برسوں کی شدید مفلسی کے بعد یہ ہوٹل مجھے ملا تھا۔ سوچتا تھا کہ اب تنہا مالک ہوں بالکل آزادی ہے اور میں اسے خوب سجاؤں گا۔ مگر موت نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

اور ریڈ فورٹ ہوٹل ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔

ہم ابھی دوسری چھت تک بھی نہ پہنچنے پائے تھے کہ اوپر سے گولیوں کا مینہ برسنے لگا ہمارے سامنے دو تین آدمی بھیانک چیخیں مار کر ساکت و صامت پڑ گئے اور میں اور علی محمد چھت پر سے نیچے کود پڑے۔ سکینہ چھت کی منڈیر پر سے منہ نکالے نیچے جھانکنے لگی۔ گھبرائی ہوئی۔ مدد طلب نگاہوں سے نیچے دیکھنے لگی۔ علی محمد چیخنے لگا۔

نیچے کود پڑو —— کود پڑو نیچے —— سکینہ!!

مگر اوپر سے گولیوں کا مینہ تیز ہو گیا۔ میں اور علی محمد مُردوں کی طرح دم سادھے زمین پر اوندھے منہ گر پڑے جب گولیوں کا مینہ تھم گیا تو ہم نے دیکھا کہ بارود کے بادلوں میں سکینہ لمحہ بھر کے لئے بجلی کی طرح چمکی، کڑکی ——— گری نہیں بس کوند کر غائب ہو گئی۔

مینہ جیسے علی محمد کی آنکھوں سے برسنے لگا اور پرانے قلعے کے پناہ گزین کیمپ تک پہنچتے پہنچتے اس کے سارے آنسو جیسے ختم ہو گئے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں کو دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی بھر کا رونا منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ کچھ نیم پاگل سا ہو گیا تھا ——— سب لاہور جانے والے تھے مگر وہ چاندنی چوک واپس جانا چاہتا تھا۔ سب کو زندگی کی تلاش تھی۔ وہ مرنا چاہتا تھا ——— میں نے اسے ڈھارس دی۔ نہ صرف کیمپ کے پھاٹک سے واپس لایا بلکہ موت سے زندگی کی طرف لے آیا۔ کیمپ میں ایسے بہت سے لوگوں سے ملایا جن کی بیویاں بھی اغوا کر لی گئی تھیں۔ جن کے بچے بھی چھن گئے تھے۔ ایسے بہت سے سینکڑوں لوگوں کے درمیان علی محمد تنہا تو نظر ہی نہیں آتا تھا اور پھر وہ تو ایک حجام تھا۔ بڑے بڑے شرفا اپنی عورتیں چھوڑ آئے تھے تو یہ علی محمد ——— !! بڑی مشکلوں سے میں نے علی محمد کو پاکستان چلنے پر رضامند کر لیا۔

دلی اور لاہور کے بیچوں بیچ ساری زمین موت بنی پھیلی ہوئی تھی جس پر "پاکستان سپیشل ٹرین" زندگی کی ایک باریک، منحنی سی لکیر بنی رینگ رہی تھی۔ چار دن مسلسل رینگتے رہنے کے بعد زندگی کی یہ پتلی سی منحنی موج جیسے زندگی کے سمندر میں جا ملی ——— اسی لئے لاہور ریلیف فارم پر قدم رکھتے ہی علی محمد نے بھی اچانک سکینہ اور بچے کو بھول کر ایک زوردار نعرہ لگا ہی دیا ——— پاکستان زندہ باد ——— یعنی علی محمد زندہ باد۔ بات یہی تھی مفہوم

یہی تھا۔ جیسے زندگی کا انسان سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ بلکہ مقام سے تھا جگہ سے تھا علی محمد کی زندگی لاہور سے شروع ہوتی ہے تو نریندر سنگھ کے لئے زندگی کا آغاز امرتسر سے ہوتا ہے اور لاہور اور امرتسر کے درمیان ریل گاڑیاں گویا لاشیں اٹھائے ادھر سے ادھر دوڑتی پھرتی ہیں —— لاہور پہنچتی ہیں تو لاشیں زندہ ہوتی ہیں اور پاکستان بن جاتا ہے۔ امرتسر پہنچتی ہیں تو لاشیں پھر زندہ ہو جاتی ہیں اور ہندوستان وجود میں آتا ہے۔

لاشوں نے ہندوستان بنایا۔

لاشوں نے پاکستان بنایا۔

مگر چلو شکر ادا کرو کہ پاکستان پہنچ گئے۔

کچھ دن والٹن کیمپ میں رہنے کے بعد مہاجرین لاہور کے گلی کوچوں میں پھیلنے لگے۔ میں نے بھی میکلوڈ روڈ کے ایک خالی مکان پر قبضہ کر لیا اور علی محمد کی منت سماجت اور اس کی لٹی ہاری تباہ حال زندگی پر ترس کھا کر میں نے اسے بھی ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔

پہلے پہلے بڑے کھوکھلے، بڑے خالی دن آئے۔ ایسے بھکاری دن جن کا کشکول خالی تھا جن میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ روٹی کا ایک ٹکڑا نہیں مگر جلد ہی مجھے ڈپٹی کمشنر آفس میں کلرکی کی جگہ مل گئی۔ گریجویٹ تو نہیں تھا مگر میں نے بڑی دیدہ دلیری سے عام مہاجرین کی طرح گپ ہانک دی کہ ہاں دہلی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوں۔ اس ہنگامے میں جہاں سارا گھر جل گیا سارا سامان جل گیا۔ میری بی اے کی ڈگری بھی جل گئی۔ گپ اور جھوٹ کی ان دنوں بڑی فراوانی اور بڑی قدر تھی —— اور جھوٹ کی بنیاد پر میں نے اپنی نئی زندگی کھڑی کر دی۔

کچھ دنوں بعد علی محمد کو بھی لکشمی چوک میکلوڈ روڈ پر ایک چھوٹا سا "حجام خانہ" مل گیا۔

اسے "حجام خانہ" ہی کہنا چاہیئے کیونکہ اس کے دہلی کے "دی فیمس ہیر کٹنگ سیلون" کے مقابلہ میں یہ گویا "حجام خانہ" ہی تھا۔ علی محمد بڑی محنت سے کام کرنے لگا۔ اپنی بیوی بچوں کی اذیت ناک جدائی یاد دنیا کے کسی اور غم کو بھلانے کا ایک ہی طریقہ ہے —— کام —— بہت زیادہ کام ——

اب ہمارے ہر آنے والے دن کے ہاتھ میں کافی بھرا ہوا کشکول ہوتا۔ شام کو اجالا جب افقی پہاڑوں کی طرف بسیرا لینے جانے لگتا تو ہمیں کافی روپے اور روٹی کے بہت ٹکڑے دے کر چلا جاتا۔

اب پاکستان ہمارے لئے اجنبی نہ رہا تھا۔ بہت سے ہندوستانی دوست مل گئے تھے اور نئے نئے دوست پیدا ہو رہے تھے —— ہم ہر شام خواجہ صابر دہلوی کے ہوٹل میں بیٹھے رہتے۔ وہاں ریڈیو بھی تھا اور "امروز" "زمیندار" "انقلاب" وغیرہ بھی آیا کرتے تھے۔ میں جب کبھی کوئی اخبار اٹھاتا تو علی محمد ضرور کہتا:

"بابوجی —— ذرا یہ عورتوں کی فہرست پڑھ کر سنانا۔ ممکن ہے اس میں سکینہ کا نام کہیں ہو۔"

اور میں خود بھی اخبار میں سب سے پہلے بازیافتہ خواتین کی فہرست ہی دیکھا کرتا تھا میرے لئے سارے اخبار میں سوائے اس کے اور کوئی دلچسپی کی چیز نہیں ہوتی تھی۔ میں روز باواز بلند علی محمد کو اور سب کو مغویہ عورتوں کے نام اور ان کی ذات بالخصوص ان کی عمریں بڑی دلچسپی سے سنایا کرتا تھا۔

شریفاں ۱۸ سال گوجر نرائین گڑھ امرتسر

تاجاں	۲۲ سال	جولاہا	ڈاہروالہ	گورداسپور
سرداراں	۱۵ ؍؍	تیلی	رامامنڈی	پٹیالہ
اللہ رکھی	۲۷ ؍؍	دھوبی	حبآب چند	فیروزپور
ہیراں	۲۰ ؍؍	سقّہ	ڈرالہ	کرنال
زینب	۲۳ ؍؍	حجام	حسن پور	گوڑگاؤں
ظہوراں	۲۱ ؍؍	ترکھان	مورنڈہ	انبالہ

جب میں فہرست ختم کرتا تو علی محمد گہرے غم میں کھو جاتا۔ اس کی چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جاتی اور اس کا تار مارکہ سگرٹ دیر سے کش نہ لینے کے باعث بجھ جاتا۔ جیسے اس کا دل بجھا رہتا تھا۔ بالکل اس کی بجھی ہوئی زندگی کی طرح .... مگر کوئی علی محمد کی طرف نہیں دیکھتا۔ سب جیسے اپنے آپ میں کھو جاتے یا ان لڑکیوں اور عورتوں کے غول میں گھر جاتے —— بڑی دیر تک ہم میں سے کوئی بھی بات نہ کرتا۔ علی محمد بس پتھر کا بت بنا بیٹھا رہتا۔ میں علی محمد سے اکثر کہا کرتا تھا کہ تمہیں پوری فہرست سننے کی کیا ضرورت ہے۔ جس دن تمہاری سکینہ کا نام ہی دیکھ لوں گا۔ تمہیں بتا دوں گا۔ وہ وعدہ کر لیتا۔ مگر دوسرے دن پھر فہرست سنے بغیر اسے جیسے چین ہی نہ آتا تھا اور فہرست سننے کے بعد نیند نہیں آتی تھی۔ اس سے اس کی صحت پر بڑا برا اثر پڑنے لگا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ پاگل بھی ہو جاتا تھا اور بڑبڑانے لگتا۔

سب غریبوں کی جوان جوان عورتیں ہی اٹھا لے گئے سالے، ایک بھی بڑے آدمی کی عورت غائب نہیں ہوئی جو مصیبت آتی ہے۔ غریبوں پر ہی آتی ہے۔

بالوجی ـــــ آننج فہرست دیکھو تو سکینہ کا نام دیکھنے کی ضرورت نہیں ہاں کسی بڑے آدمی کی کوئی عورت نظر آئے تو مجھے بتانا میں اس کا حق دار بن کر اسے اپنے پاس لاؤں اور ان سالے بڑے بڑے آدمیوں سے پورا پورا بدلہ چکاؤں گا ....

علی محمد کو بڑے آدمیوں بلکہ لیڈروں سے بھی شدید نفرت ہو گئی تھی۔ وہ ایک ہی سانس میں بڑے آدمیوں اور بہت ہی بڑے آدمیوں کو دھوکے باز کہہ دیتا تھا۔ ہماری محفلوں میں ایک دوست ایسے بھی تھے جو خاص لاہور کے رہنے کے علاوہ پنجاب مسلم لیگ کے کوئی چھوٹے موٹے لیڈر بھی تھے۔ وہ اکثر علی محمد سے اسی بات پر جھگڑ پڑتے تھے کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ یہ جھگڑے وگڑے تو سب انگریز نے کرائے ہیں۔ اس میں ہمارے بے چارے بڑے آدمیوں کا کیا قصور ـــــ ؟ وہ بے چارے بھی تو ان فسادات میں بہت تباہ ہوئے۔ کل تک جو لکھ پتی تھے آج کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے ہیں ـــــ علی محمد جل کر رسی کی طرح بل کھانے لگتا۔

مولانا ـــــ او مولانا۔ آپ کو تو یہاں لاہور میں بیٹھے بیٹھے پاکستان مل گیا۔ ہم تو دہلی سے پاکستان ہتھیلی پر رکھ کر چلے تھے ـــــ مانتا ہوں کہ جھگڑا فساد انگریز نے بھی کرایا ہے، مگر یہ سالے بھی کیا کچھ کم ہیں ـــــ میں سیٹھ کریم بخش کو اچھی طرح جانتا ہوں جنہوں نے دہلی میں اپنے محلے کے سارے غنڈوں میں مفت ہتھیار اور روپے اسی لئے تقسیم کئے تھے کہ ہندوؤں اور سکھوں کو مارو تاکہ ہندو اور سکھ ہماری بہو بیٹیوں سے ان کا بدلہ چکائیں ـــــ ابھی ایک بار تو انہوں نے خود

مجھے ایک چھرا اور چالیس روپے دیئے کہ سیٹھ رام داس کو قتل کر آؤ۔ مگر میں بھی بڑا کائیاں ہوں۔ روپیہ اور چھرا دونوں ہضم کر گیا اور انہیں صورت ہی نہیں دکھائی۔ اب سنا ہے کہ انہوں نے یہاں کوئی سینما الاٹ کرا لیا ہے ——————

واہ رے کریم بخش واہ ——————

علی محمد اور ان مولانا میں اکثر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد علی محمد کی حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی۔ بعض بعض اوقات تو علی محمد سے مجھے بھی سخت کوفت ہونے لگتی تھی۔ وہ جیسے میرے اعصاب پر ایک بوجھ سا بن گیا تھا۔ اچھی خاصی خوش باش محفل جمی ہوئی ہے اور یہ سکینہ کی یاد میں منہ لٹکائے بیٹھا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اس نے سکینہ کی بات چھیڑ دی۔ چائے پی رہے ہیں اور کہہ رہا ہے بابو جی —— کبھی آپ سکینہ کے ہاتھوں بنائی ہوئی چائے پیتے۔ پان کھا رہے ہیں۔ اس نے سکینہ کی گلوریوں کی تعریف شروع کر دی۔ رات سوتے سوتے آنکھ کھلی۔ علی محمد جاگ رہا ہے۔ بھئی کیوں جاگ رہے ہو؟ بابو جی سکینہ یاد آ رہی ہے۔ کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا۔ بھئی کیوں نہیں کھاتے، سکینہ کے بغیر حلق سے نوالے نہیں اترتے۔

سکینہ سکینہ سکینہ —— ہر وقت ہر لمحہ سکینہ کا نام اور اس کی تعریف سنتے سنتے مجھے سکینہ سے بھی خدا واسطے کا بغض ہو گیا تھا۔ یقیناً سکینہ میں مجھ جیسے آوارہ نوجوان کے لئے بڑی دل کشی تھی مگر حد ہوتی ہے۔ ان فسادات میں آخر لاکھوں کے لگ بھگ عورتیں اغوا ہوئیں۔ ہزاروں کے قریب بچے ضائع ہوئے۔ اب یہ علی محمد

کوئی واحد انسان تو نہیں تھا کہ صرف اسے ہی اپنی بیوی اور اپنے بچے سے پیار ہو۔ باقی سب کے دل میں پتھر ہے یا بے جگر ہیں۔ ہر آدمی کو اپنے بیوی بچے، عزیز، رشتہ دار اتنے ہی پیارے ہوتے ہیں ——— اور اب جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب کیا کیا جا سکتا تھا ——— ؟ بیٹھے کوس رہے ہیں کہ یہ کوئی آسمانی بلا تھی۔ مگر یہ تو محض زمین کی بلا تھی۔ جو زمین کے بڑے بڑے ناجائز حق داروں، سرمایہ داروں اور لیڈروں نے انسان پر مسلط کر دی تھی ——— اب اگر کوئی زمین کے ان ناجائز بیٹوں کا گریبان پکڑنے کے بجائے آسمان کو کوسنے لگے .... آسمان تو کوئی چیز ہے ہی نہیں ———

علی محمد دوسرے مہاجرین کے مقابلے میں پھر بھی بڑی اچھی حالت میں تھا۔ اسے رہنے کے لئے مکان، زندہ رہنے کے لئے روزگار۔ خوش رہنے اور وقت گزارنے کے لئے دوست اور پھر خواجہ صاحب دہلوی کا ہوٹل مل گیا تھا۔ دوسرے بہت سے ہزاروں مہاجرین تو ابھی فٹ پاتھوں پر بھیک مانگتے تھے۔ ابھی زندگی کو سڑکوں پر ڈھونڈ رہے تھے۔

ہمارے دوسرے دوست بھی علی محمد سے تنگ آ چکے تھے کیونکہ ایک افسردہ اور غمگین دوست ساری محفل کو اداس اور غمگین بنا دیتا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ عام آدمی کی طرح یار دوستوں کی محفل میں ہنستا بولتا رہے۔ خود خوش نہ رہے تو کم از کم ہمیں تنگ نہ کرے۔

ایک دن ہمارے ایک دوست فیاض نے علی محمد کو مشورہ دیا:

"یار ——— جو قسمت میں ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب کب تک تم یوں ہی روتے رہو گے۔ اب دو سال ہو گئے۔ تمہاری بیوی اگر زندہ ہوتی تو اب تک اس کا

کوئی نہ کوئی پتہ چل جاتا ——— وہ بے بیچاری اب شاید اللہ کو پیاری ہو چکی۔ اب اس کا انتظار بے کار ہے۔ نیا وطن ہے نئی زندگی شروع کرو۔ خیر سے اب تم خوب کھانے کمانے لگے ہو ——— تم اگر ہاں کر دو تو پھر ہم سب ٹھیک ٹھاک کرلیں گے۔"

رات علی محمد نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے بھی یہی صلاح دی کہ ہاں اب سکینہ کا خیال چھوڑ دو۔ اب تک کتنی ہزار عورتیں واپس لائی گئیں مگر سکینہ نہیں آئی۔ اب کیا فائدہ ہے اس طرح زندگی کو ایک لمبے سوگ میں جلاتے رہنے سے؟

علی محمد نے کہا:

"بس ایک مہینہ اور انتظار کرلوں۔ ہر اخبار میں اشتہارات چھپواؤں گا۔ ایک مہینے تک اس کا کوئی پتہ نہ چلے تو پھر میں راضی ہوں۔"

ایک مہینہ تک علی محمد حجام چوک لکشمی میکلوڈ روڈ کی طرف سے مقامی اخباروں میں اشتہار چھپتا رہا ——— تلاش گم شدہ ——— مسماۃ سکینہ زوجہ علی محمد حجام سکنہ چاندنی چوک دہلی جہاں کہیں بھی ہو اسے معلوم ہوئے کہ اس کا خاوند علی محمد پاکستان آگیا ہے اور لاہور شہر میں لکشمی کے چوک میں مقیم ہے۔ مسماۃ سکینہ جہاں کہیں بھی ہو فوراً اپنے پتے سے مطلع کرے یا خود آجائے ———

اشتہار چھپتا رہا اور فہرستیں شائع ہوتی رہیں۔

عائشہ	۱۴ سال	موچی	شاہ گنج	دہلی
پھول بانو	۱۷ "	حلوائی	کھڑ نوالہ چک	بیکانیر

سیلماں	۲۴ سال	درزی	رام کوٹ	جموں
امرتی	۲۸ 〃	بڑھئی	الور خاص	الور
زیباں	۲۲ 〃	ٹیکسی ڈرائیور	کوچہ ناصر خاں	دہلی
جیناں	۱۹ 〃	لوہار	تھانہ شاہ کوٹ	جالندھر
شیداں	۲۵ 〃	کمہار	تھانہ مرادنگر	میرٹھ

ایک مہینہ بھی گزر گیا۔ سکینہ نہیں آئی۔ اور ہم سب دوستوں نے ہمارے ملنے والے ایک بزرگ مہاجر شیخ تاج الدین دہلوی کی لڑکی بانو سے علی محمد کو منسوب کرا دیا شیخ تاج الدین بڑی تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بیوی فسادات میں ماری گئی تھی۔ صرف اکلوتی لڑکی کو بچا کر لائے تھے اور وہ بھی اسی لئے بچا سکے تھے کہ بانو دہلی میں ابھی بالغ نہ ہوئی تھی ورنہ ——— اب پاکستان آکر وہ بالغ ہو گئی تھی۔ اور پتھر کی سل کی طرح شیخ تاج الدین کے سینہ پر دھری تھی۔ وہ بے چارے میو ہسپتال کے پیچھے ایبک روڈ کے فٹ پاتھ پر کٹ پیس کپڑوں کا ایک چھوٹا سا اسٹال چلاتے تھے۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا۔ جس دن شیخ تاج الدین کی بانو نفیری کی ایک میٹھی لے بن کر علی محمد کی زندگی کے سناٹے میں گونج اٹھی۔ گونجنے لگی۔ خوش رنگ پھول بن کر مہکی اور مہکنے لگی چاند بن کر اس کے اندھیرے میں طلوع ہوئی۔ اور جگمگانے لگی۔

شادی کے بعد علی محمد بڑا خوش رہنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے سکینہ کو بانو کے جسم کے پیچھے چھپا دیا ہے تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ وہ یوں بحال رہتا جیسے یہ اس کی پہلی شادی ہے۔ اب سکینہ

کا نام پھر کبھی سننے میں نہیں آیا۔ یوں تو کام کے بعد علی محمد اکثر گھر میں گھسا رہتا۔ کبھی کبھی ملتا تو ہنسی مذاق کی باتیں کرتا۔ دن گزرنے لگے اور اچھے گزرنے لگے۔

مگر ایک دن ـــــــــ ایک شام ہم سب اپنے اپنے کاموں سے تھکے ہارے لوٹ کر خواجہ صابر دہلوی کے ہوٹل میں چائے پی رہے تھے اور میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر میرے پسندیدہ کالموں پر پڑی۔ بازیافتہ عورتیں مغویہ عورتیں، میں باآواز بلند ان کے نام سب کو سنانے لگا۔

جمیلہ	زوجہ	فرید و جاٹ	۲۲ سال	چپڑاسی	سرسادا	لدھیانہ
مجیدن	زوجہ	حفیظ جہاں	۱۸ ″	قصائی	ہیلاک	بھرت پور
بی بی	دختر	عظیم جہاں	۱۴ ″	تیلی	×	نابھ
جیجاں	زوجہ	برکت علی	۱۹ ″	ارائیں	پھنول	ہوشیار پور
جنت بی بی	دختر	فقیر محمد	۱۷ ″	قلعی گر	کناری بازار	آگرہ
سکینہ	زوجہ	علی محمد	....			....

میں چیخ اٹھا:۔

"ارے ـــــــــ!!"

سب دوستوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا:

"کیوں بابو جی ـــــــــ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا:

"علی محمد ـــــــــ یہ کیا ہو گیا!!"

علی محمد نے حیران ہو کر پوچھا:

"کیوں بابو جی ——— کیا ہو گیا ہے ——— ؟"

میں دو تین لمحے تک چپ رہا اور ایک لمبی سانس لے کر بولا:

"سکینہ زوجہ علی محمد حجام سکنہ چاندنی چوک دہلی۔"

علی محمد بھی چیخ پڑا:

"کیا ——— کیا وہ زندہ ہے؟ —— کہاں ہے وہ ———

بابو جی۔ بتاؤ ——— بولو بابو جی ——— !!"

سارے ہوٹل پر سناٹا چھا گیا۔ صرف اس سناٹے پر علی محمد کی بڑبڑاہٹ ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھی۔

گھر لوٹنے کے بعد بڑی دیر تک علی محمد سے یہی گفتگو ہوتی رہی کہ کیا کیا جائے۔ آخر طے پایا کہ اسے گھر لایا جائے آخر بے چاری کا قصور ہی کیا ہے؟

دوسرا دن گزر گیا

پھر مہینے گزر گئے

ساری بازیافتہ عورتیں اپنے اپنے ورثاء کے ساتھ چلی گئیں۔ لیکن سکینہ تنہا دارالخواتین کے بڑے دروازے کو تکتی رہی اور گھورتی رہی۔

آخر کار ایک دن سکینہ کا وارث اسے لینے آ ہی گیا۔ دارالخواتین کی انچارج افیسر روتے روتے پکار اٹھی ——— "سکینہ۔ جاؤ۔ تمہارا وارث تمہیں لینے آیا ہے۔ جاؤ سکینہ جاؤ۔ جاؤ۔"

سکینہ نہ مسکرائی نہ کچھ بولی چپ چاپ اپنے وارث کے ساتھ ایک اور نئے ملک کی طرف روانہ ہو گئی۔